فہرست

معرفت خدا کے دس سبق

پہلا سبق: خدا کی تلاش

دوسرا سبق. ہماری زندگی میں خدا کے وجود کی نشانیاں

تیسرا سبق خدا کی معرفت کے دو اطمینان بخش راستے

چوتھا سبق ایک اہم سوال کا جواب

پانچواں سبق: ایک سچا واقعہ

چھٹا سبق: خدا کی معرفت کا دوسرا راستہ

ساتواں سبق: نظام خلقت کے چند نمونے

آٹھواں سبق: ایک چھوٹے سے پرندے میں حیرت انگیز دنی

نواں سبق: حشرات اور پھولوں کی دوستی!

دسواں سبق: نہایت چھوٹی مخلوقات کی دنی

دسویں سبق کی ایک تکمیلی بحث

عدل الٰہی کے دس سبق

پہلا سبق عدل کیا ہے؟

دوسرا سبق: عدل الٰہی کے دلائل

تیسرا سبق: آفات وبلیّات کا فلسفہ(۱)

چوتھا سبق: آفات وبلیّات کا فلسفہ(۲)

پانچواں سبق; آفات وبلیّات کا فلسفہ(۳)

چھٹا سبق: جبر واختیار کا مسئلہ

ساتواں سبق: ارادہ واختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل

آٹھواں سبق: "امر بین الامرین" (یا وسطی مکتب) کیا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نواں سبق: ہدایت وگمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے
دسواں سبق: عدل الٰہی اور مسئلہ "خلود"
نبوت کے دس سبق:
پہلا سبق: رہبران الٰہی کی ضرورت
دوسرا سبق: قانون گزاری کے لئے انبیاء کی ضرورت
تیسرا سبق: انبیاء کیوں معصوم ہیں؟
چوتھا سبق: پیغمبر شناسی کا بہترین طریقہ
پانچواں سبق: پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ والہ والسلم) کا سب سے بڑا معجزہ
چھٹا سبق: قرآن مجید کے اعجاز کی ایک جھلک
ساتواں سبق: خداشناسی کے بارے میں قرآن مجیدک
آٹھواں سبق: قرآن مجید اور جدید سائنسی انکشافات
نواں سبق: پیغمبر اسلام (ص) کی حقّانیت پر ایک اور دلیل
دسواں سبق: (صلی اللہ علیہ والہ والسلم) کا خاتم الانبیاء ہون
امامت کے دس سبق
پہلا سبق: امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی؟
دوسرا سبق: امام کے وجود کا فلسفہ
تیسرا سبق: امام کے خاص شرائط وصفات
چوتھا سبق: امام کا تعیّن کس کے ذمہ ہے؟
پانچواں سبق: قرآن اور امامت
چھٹا سبق: امامت، سنّت نبی کی روشنی میں
ساتواں سبق: حدیث "منزلت" اور حدیث "یوم الدار"
آٹھواں سبق: حدیث "ثقلین" اور حدیث "سفینہ"
نواں سبق: بارہ امامؑ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دسواں سبق: حضرت مہدی (عج) بارہویں امام اور دنیا کے مصلح اعظم
معاد کے بارے میں دس سبق
پہلا سبق: ایک اہم سؤال
دوسرا سبق: معاد زندگی کو معنی بخشتی ہے
تیسرا سبق: قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپ کے وجود میں ہے
چوتھا سبق: معاد، فطرت کی جلوہ گاہ میں
پانچواں سبق: قیامت، انصاف کی ترازو میں
چھٹا سبق: معاد کا اسی دنیا میں مشاہدہ
ساتواں سبق: معاد اور تخلیق کا فلسفہ
آٹھواں سبق: روح کی بقاء، قیامت کی ایک علامت
نواں سبق: جسمانی اور روحانی معاد
دسواں سبق: جنّت، جہنّم اور تجسّم اعمال
نوجوانوں
کے لئے اصول عقائد کے پچاس سبق

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

معرفت خدا کے دس سبق

پہلا سبق: خدا کی تلاش

۱۔کائنات سے واقفیت کا شوق

خلقت کائنات کے بارے میں آگاہی اور آشنائی حاصل کرنے کا شوق ہم سب میں پایا جاتا ہے۔

یقیناً ہم سب جاننا چاہتے ہیں:

خوبصورت ستاروں سے چمکتا ہوا یہ بلند و بالا آسمان، دلکش مناظر سے بھری یہ وسیع زمین، یہ رنگ برنگ مخلوقات، خوبصورت پرندے، طرح طرح کی مچھلیاں، سمندر اور پہاڑ، کلیاں اور پھول، سر بہ فلک قسم قسم کے درخت اور..کیا خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا یہ عجیب و غریب نقشے کسی ماہر، قادر و غالب نقاش کے ہاتھوں کھینچے گئے ہیں؟..

اس کے علاوہ ہماری زندگی میں ہم سب کے لئے جو ابتدائی سوالات پیدا ہوتے ہیں، وہ یہ ہیں:

ہم کہاں سے آئے ہیں؟ کہاں پر ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟

اگر ہم ان مذکورہ تینوں سوالات کے جواب جانیں تو کتنے خوش قسمت ہوں گے؟ یعنی ہم جانیں کہ ہماری زندگی کا آغاز کہاں سے ہوا ہے اور سرانجام کہاں جائیں گے؟ اور اس وقت ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

ہمارا ضمیر ہم سے کہتا ہے: مذکورہ سوالات کے جواب حاصل کرنے تک آرام سے نہ بیٹھنا۔

کبھی کوئی شخص ٹریفک حادثہ میں زخمی ہو کر بے ہوش ہو جاتا ہے اور معالجہ کے لئے اسے ہسپتال لے جاتے ہیں۔ جب اس کی حالت قدرے بہتر ہوتی ہے اور وہ ہوش میں آتا ہے تو اپنے اردگرد موجود افراد سے اس کا پہلا سوال یہ ہوتا ہے: یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے کیوں یہاں لایا گیا ہے؟ میں کب یہاں سے جاؤں گا؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایسے سوالات کے مقابلہ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا ہے۔

اس لئے جو چیز ہمیں سب سے پہلے خدا کی تلاش اور خالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے پر مجبور کرتی ہے، وہ ہماری تشنہ اور متلاشی روح ہے۔

۲۔شکر گزاری کا احساس۔

فرض کیجئے آپ کی ایک محترم مہمان کی حیثیت سے دعوت کی گئی ہے اور آپ کی مہمان نوازی اور آرام وآسائش کے تمام وسائل مہیا کئے گئے ہیں۔لیکن چونکہ یہ دعوت آپ کے بڑے بھائی کے توسط سے انجام پائی ہے اور اپنے اسی بھائی کے ہمراہ دعوت پر گئے ہیں اور وہ اپنے میز بان کو اچھی طرح سے نہیں پہچانتے،اس لئے اس دعوت پر پہنچتے ہی آپ سب سے پہلے اپنے میز بان کو پہچان کر اس کا شکریہ بجالانے کی کوشش کریں گے۔

ہم بھی جب خالق کائنات کے بچھائے ہوئے خلقت کے اس وسیع دسترخوان پر نظر ڈالتے ہیں اور بینائی والی آنکھیں، سننے کے کان، عقل وہوش، مختلف جسمانی اور نفسیاتی توانائیاں، زندگی کے مختلف وسائل اور پاک و پاکیزہ رزق جیسی گوناگوں نعمتوں کو اس وسیع دسترخوان پر دیکھتے ہیں تو بے ساختہ اس فکر میں پڑ جاتے ہیں کہ یہ تمام نعمتیں عطا کرنے والے کو پہچان لیں اور اگر چہ وہ ہمارے شکریہ کا محتاج بھی نہ ہو،ہمیں اس کا شکریہ بجالانا چاہئے اور جب تک یہ کام انجام نہ دیں،ہم بے چینی اور کمی کا احساس کرتے ہیں،لہذا یہ ایک اور دلیل ہے جو ہمیں خدا کو پہچاننے کی طرف ترغیب دیتی ہے۔

۳۔خدا کی معرفت سے ہمارے نفع ونقصان کا تعلق۔

فرض کیجئے اپنے سفر کے راستہ پر آپ ایک چوراہے پر پہنچے،وہاں پر شور وغل برپا ہے،سب پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اس چوراہے پر نہ رکئے،یہاں بڑے خطرات ہیں۔لیکن ہر ایک ہماری الگ الگ راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ایک کہتا ہے: بہترین راستہ یہ ہے کہ مشرق کی طرف چلے جائیں،دوسرا مغرب کی طرف مطمئن ترین راستہ بتاتا ہے اور تیسرا ہمیں ان دوراستوں کے بیچ والے راستہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے،اور کہتا ہے خطرہ سے بچنے کا اور منزل نیز امن وامان اور سعادت وخوش بختی کی جگہ تک پہنچنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔

کیا ہم یہاں پر غور وفکر اور تحقیق کئے بغیر ان راستوں میں سے کسی ایک راستہ کا انتخاب کریں گے؟ یا ہماری عقل ہمیں یہ حکم دے گی کہ وہیں پر رکے رہیں اور کسی راستہ کا انتخاب نہ کریں؟ قطعاً ایسا نہیں ہے۔

بلکہ عقل ہمیں حکم دیتی ہے کہ اس حالت میں جتنی جلد ممکن ہو تحقیق کریں اوران افراد کی تجویزوں میں سے ہر ایک پر غور وفکر کے بعد جس کسی کے بارے میں صحیح اور سچ ہونے کی نشانیاں اور اطمینان بخش دلائل

موجود ہوں، اسے قبول کریں اور اطمینان کے ساتھ اس راہ کو منتخب کر کے آگے بڑھیں۔

اس دینوی زندگی میں بھی ہماری یہی حالت ہے۔مختلف مذاہب اور مکاتب فکر میں سے ہر ایک ہمیں اپنی طرف دعوت دیتا ہے۔لیکن چونکہ ہماری تقدیر، ہماری خوشبختی و بدبختی، ہماری ترقی وتنزل کا دار ومدار بہترین راستہ کی تحقیق اور اس کے انتخاب کرنے پر ہے، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اس سلسلہ میں غور وفکر کریں اور جو راستہ ہماری ترقی وتکامل کے موجب ہو اسے اپنے لئے چن لیں اور جو ہماری نابودی، بدبختی اور بربادی کا سبب ہو اس سے پرہیز کریں۔یہ بھی ہمارے لئے خالق کائنات کے بارے میں مطالعہ اور تحقیق کرنے کی طرف دعوت کرنے کی ایک اور دلیل ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

فَبَشِّرْ عِبَادِ ﴿١٧﴾ الَّذِينَ يَسْتَمِعُونَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ (سورئہ زمر دآیہ/۱۸)

"میرے ان بندوں کو بشارت دیجئے، جو مختلف باتوں کو سنتے ہیں اور ان میں جو بات اچھی ہوتی ہے اسی کا اتباع کرتے ہیں۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے:

۱۔کیا آپ نے خدا کی معرفت کے سلسلہ میں جو کچھ آج تک اپنے ماں باپ سے سنا ہے، اس کے علاوہ اس بارے میں خود بھی سنجیدگی سے غور کیا ہے؟

۲۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ خدا کی تلاش اور خدا کی معرفت میں کیا فرق ہے؟

۳۔کیا آپ نے خداوند متعال سے راز و نیاز کے دوران کبھی ایک عمیق روحانی لذت کا احساس کیا ہے؟

دوسرا سبق۔ہماری زندگی میں خدا کے وجود کی نشانیاں

فرض کیجئے کہ آپ کا ایک دوست سفر سے لوٹا ہے اور آپ کے لئے تحفہ کے طور پر ایک کتاب لایا ہے اور اس کتاب کے بارے میں کہتا ہے کہ یہ ایک بہترین کتاب ہے کیونکہ اس کا مصنف ایک غیر معمولی فطانت کا مالک، دانشور، آگاہ، ماہر اور اپنے فن میں ہر لحاظ سے انوکھا اور استاد ہے۔

آپ اس کتاب کا ہرگز سرسری مطالعہ نہیں کریں گے بلکہ اس کے برعکس اس کے تمام جملوں حتی اس کے لفظ لفظ پر غور وخوض کریں گے اور اگر اس کے کسی جملہ کو نہ سمجھے تو گھنٹوں بلکہ شاید مسلسل کئی دنوں تک فرصت پانے پر اس کے بارے میں سعی و کوشش کریں گے تا کہ اس کا معنی ومفہوم آپ کے لئے واضح ہو جائے، کیونکہ اس کا مصنف ایک عام انسان نہیں ہے بلکہ ایک ایسا عظیم دانشور ہے جو سوچے سمجھے بغیر ایک لفظ بھی نہیں لکھتا ہے۔

لیکن اگر اس کے برعکس آپ سے کہا جائے کہ(اگر چہ ممکن ہے یہ کتاب بظاہر خوبصورت ہو،لیکن) اس کا مصنف ایک کم علم شخص ہے اور کسی قسم کی علمی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور اس کے کام میں کوئی نظم وضبط نہیں ہے!

واضح ہے کہ آپ اس قسم کی کتاب پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور جہاں پر بھی کوئی نا قابل فہم مطلب نظر آئے گا اسے مصنف کی کم علمی کا نتیجہ تصور کریں گے اور سوچیں گے کہ اس پر وقت صرف کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے!

کائنات کی مثال بھی ایک عظیم کتاب کے مانند ہے کہ اس میں موجود ہر مخلوق اس کا ایک لفظ یا جملہ ہے۔ایک خدا شناس شخص کی نظر میں کائنات کے تمام ذرّات قابل غور ہیں۔ایک باایمان انسان خدا پرستی کے نور کے پرتو میں ایک خاص تفکر وتدبر کے ساتھ خلقت کے اسرار کا مطالعہ کرتا ہے(اور یہی موضوع انسان کے علم ودانش کی ترقی میں مددگار ثابت ہوتا ہے) کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کائنات کا خالق، بے انتہا علم وقدرت رکھتا ہے،اور اس کے تمام کام حکمت وفلسفہ کی بنیاد پر ہیں،اس لئے وہ اور باریک بینی کے ساتھ

مطالعہ کرتا ہے، گہری تحقیق کرتا ہے تا کہ اس کے اسرار کو بہتر صورت میں درک کرے۔

لیکن ایک مادہ پرست انسان خلقت کے اسرار کا گہرا مطالعہ کرنے کا شوق ہی نہیں رکھتا ہے، کیونکہ وہ بےشعور طبیعت کو ان کا خالق جانتا ہے۔ اگر ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض مادی دانشور سائنسی ایجادات انجام دیتے ہیں، یہ اس لئے ہے کہ وہ غالباً خدا کو قبول کرتے ہیں، صرف اس کا نام طبیعت رکھتے ہیں، کیونکہ وہ طبیعت کے کام کے سلسلہ میں "نظم"، "حساب" اور "نظام" کے قائل ہیں۔ مختصر یہ کہ خدا پرستی علم و دانش کی ترقی کا وسیلہ ہے۔

۲۔ خدا کی معرفت اور تلاش و امید

جب انسان اپنی زندگی میں سخت اور پیچیدہ حوادث سے دوچار ہوتا ہے اور بظاہر اس پر ہر طرف سے امید کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور مشکلات کے مقابلہ میں کمزوری، ناتوانی اور تنہائی کا احساس کرتا ہے تو اس وقت خدا پر ایمان اس کی مدد کرتا ہے اور اسے توانائی بخشتا ہے۔

جو لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی اپنے آپ کو تنہا اور ناتواں نہیں پاتے، نا امید نہیں ہوتے، کمزوری اور ناتوانائی کا احساس نہیں کرتے، کیونکہ خدائی طاقت تمام مشکلات سے بالاتر ہے اور خدا کے سامنے تمام چیزیں آسان ہیں۔

ایسے لوگ پروردگار عالم کی مہربانی، حمایت اور مدد کی امید کے ساتھ مشکلات کا مقابلہ کرتے ہیں اور اپنی پوری طاقت کو بروئے کار لاتے ہیں اور عشق و امید کے ساتھ سعی و کوشش کو جاری رکھتے ہیں اور مشکلات پر غلبہ پاتے ہیں۔

جی ہاں! خدا پر ایمان انسانوں کے لئے ایک بڑا سہارا ہے۔

خدا پر ایمان استقامت اور پائداری کا سبب ہے۔

خدا پر ایمان، دلوں میں امید کی کرن کو ہمیشہ باقی رکھتا ہے۔ اسی لئے باایمان افراد کبھی خودکشی کا اقدام نہیں کرتے ہیں کیونکہ خودکشی کا سرچشمہ مکمل ناامیدی اور ناکامی کا احساس ہے، لیکن باایمان افراد نہ ہی ناامید ہوتے ہیں اور نہ ہی ناکامی کا احساس کرتے ہیں۔

۳۔خدا کی معرفت اور ذمہ داری کا احساس

ہم ایسے ڈاکٹروں کو جانتے ہیں کہ جب کوئی تنگ دست بیماران کے پاس آتا ہے تو نہ صرف وہ اس سے فیس نہیں لیتے بلکہ اس کی دوائی کے پیسے بھی اپنے جیب سے دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اپنے بیمار کے بارے میں خطرہ کا احساس کرتے ہیں تو اس کی جھونپڑی میں رات بھر اس کے سرہانے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ خدا پرست اور باایمان افراد ہیں۔

لیکن ہم ایسے ڈاکٹروں کو بھی جانتے ہیں کہ پیسے لئے بغیر بیمار کے لئے کسی قسم کا اقدام نہیں کرتے ہیں، کیونکہ یہ قوی ایمان نہیں رکھتے۔

ایک باایمان انسان جس عہدہ پر بھی فائز ہو، ذمہ داری کا احساس کرتا ہے، وہ فرض شناس ہوتا ہے، نیک اور بخشنے والا ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اپنے اندر ایک معنوی پلیس کو حاضر پاتا ہے جو اس کے اعمال کی نگرانی کرتا ہے۔

لیکن بے ایمان افراد خودخواہ، خودغرض اور خطرناک ہوتے ہیں اور اپنے لئے کبھی ذمہ داری کے قائل نہیں ہوتے۔ ان کے لئے ظلم وستم اور دوسروں کی حق تلفی کرنا آسان ہوتا ہے اور نیک کام انجام دینے کے لئے حاضر نہیں ہوتے ہیں۔

۴۔خدا کی معرفت اور سکون قلب

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ موجودہ زمانہ میں نفسیاتی اور روحی بیماریاں دوسرے زمانوں کی نسبت زیادہ ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ان بیماریوں کا ایک سبب احساس پریشانی ہے، مستقبل کے حوادث کی پریشانی ،موت کی پریشانی، جنگ کی پریشانی اور فقر ونا کامی کی پریشانی۔

لیکن اس کے بعد وہ کہتے ہیں: انسان کی روح سے پریشانیوں اور اضطرابوں کو دور کرنے والی چیزوں میں سے ایک خدا پر ایمان ہے۔ کیونکہ جب بھی پریشانی کے عوامل واسباب اس کی روح پر اثر انداز ہونا چاہتے ہیں خدا پر ایمان انھیں پیچھے ہٹا دیتا ہے۔

خدا جو مہربان ہے، خدا جو رزق دیتا ہے، خدا جو اپنے بندوں کے حالات سے آگاہ ہے اور اس کے

بندے جب بھی اس کی طرف رخ کرتے ہیں، وہ ان کی مدد کرتا ہے اور مشکلات سے انھیں نجات بخشتا ہے۔

اسی لئے حقیقی مومنین ہمیشہ سکون احساس کرتے ہیں اور ان کی روح میں کبھی اضطراب نہیں ہوتا ہے اور چونکہ ان کا کام خدا کے لئے ہوتا ہے اس لئے اگر کبھی کوئی نقصان بھی اٹھاتے ہیں تو اسی سے تلافی چاہتے ہیں، یہاں تک کہ جنگ کے دوران بھی ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ

(سورۂ انعام/ ۸۲)

"جولوگ ایمان لے آئے اور انھوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا اور انھیں کے لئے امن وسکون ہے۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ کیا آپ کو گزشتہ لوگوں کی کوئی ایسی داستان یاد ہے جو مذکورہ ایمان وآثار کی وضاحت کرے؟

۲۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ خدا پر ایمان رکھنے کا دم بھرنے والے بعض افراد کیوں اخلاقی برائیوں سے آلودہ ہوتے ہیں اور ان میں مذکورہ چار آثار نہیں پائے جاتے ہیں؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تیسرا سبق خدا کی معرفت کے دو اطمینان بخش راستے

ا۔خدا کی معرفت اور علوم کی ترقی

معرفت خدا کے بارے میں زمانہ قدیم سے آج تک بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور اس موضوع پر دانشوروں اور غیر دانشوروں میں کافی بحث وگفتگو ہوتی رہی ہے۔

اس حقیقت کو پانے کے لئے ہر ایک نے ایک راستہ کا انتخاب کیا ہے۔لیکن تمام راستوں میں سے بہترین راستے جوہمیں خالق کائنات تک جلدی پہنچا سکتے ہیں، دو راستے ہیں:

الف۔اندرونی راستہ (نزدیک ترین راستہ)

ب۔بیرونی راستہ (واضح ترین راستہ)

پہلے طریقہ میں ہم اپنے وجود کی گہرائیوں پر ایک نظر ڈالتے ہیں تا کہ توحید کی آواز کو اپنی روح کے اندر سن لیں۔

دوسرے طریقہ میں ہم وسیع کائنات پر ایک نظر ڈالتے ہیں اور تمام مخلوقات کی پیشانی پر اور ہر ذرّہ کے اندر خداوند متعال کی نشانیاں پاتے ہیں۔ان دو طریقوں میں سے ہر ایک کے بارے میں طویل بحثیں کی گئی ہیں۔لیکن ہماری کوشش یہ ہے کہ ایک مختصر بحث کے ذریعہ ان دو طریقوں کو ایک اجمالی تحقیق کے ساتھ بیان کریں۔

الف۔اندرونی راستہ

مندرجہ ذیل چند موضوعات قابل غور ہیں:

ا۔دانشور کہتے ہیں: اگر کسی بھی قوم ونسل سے متعلق ایک انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے کسی خاص قسم کی تعلیم وتربیت نہ دی جائے ،حتی خدا پرستی اور مادیت کی گفتگو سے بھی بے خبر رکھا جائے تب بھی وہ خود بخود ایک ایسی قوی طاقت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے جو مادی دنیا سے بالاتر ہے اور پوری کائنات پر حکمران ہے۔

وہ اپنے دل اور ضمیر کی عمیق گہرائیوں میں ایک لطیف ،محبت آمیز،اور متقن ومحکم آواز کا احساس

کرتا ہے جو اسے علم وقدرت کے ایک عظیم مبدا کی طرف بلاتی ہے، جسے ہم خدا کہتے ہیں۔

یہ بشر کی وہی پاک اور بے لاگ فطری کی آواز ہے۔

۲۔ممکن ہے مادی دنیا اور روزمرہ زندگی کا شور وغل اور اس کی چمک دمک اس کو اپنی طرف مشغول کرے اور وہ عارضی طور پر اس آواز کو سننے سے غافل ہو جائے ،لیکن جب وہ اپنے آپ کو مشکلات اور مصیبتوں کے مقابلہ میں پاتا ہے ،جب خطرناک طبیعی حوادث اس پر حملہ آور ہوتے ہیں جیسے سیلاب، زلزلہ،طوفان اور ایک نامناسب موسم کے سبب ہوائی جہاز میں رونما ہونے والے اضطرابی حالات سے دو چار ہوتا ہے، اس وقت وہ تمام مادی وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے اور اپنے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں پاتا ہے تو یہ آواز اس کی روح کے اندرا بھرتی ہے، وہ احساس کرتا ہے کہ اس کے وجود کے اندر سے ایک طاقت اسے اپنی طرف بلا رہی ہے، ایک ایسی طاقت جو تمام طاقتوں سے برتر ہے، ایک پر اسرار طاقت جس کے سامنے تمام مشکلات سہل اور آسان ہیں۔

آپ بہت کم ایسے لوگوں کو پائیں گے جو اپنی زندگی کے مشکل ترین حوادث میں اس قسم کی حالت پیدا نہ کریں اور بے اختیار خدا کو یاد نہ کریں۔یہی بات ہمیں بتاتی ہے کہ ہم کتنا اس کے نزدیک ہیں اور وہ کس قدر ہمارے قریب ہے، وہ ہماری روح وجان میں موجود ہے۔

البتہ فطری آواز ہمیشہ انسان کی روح میں موجود ہے لیکن مذکورہ لحظات میں یہ آواز زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔

۳۔تاریخ ہمیں اس حقیقت کی گواہی دیتی ہے کہ ایسے صاحبان اقتدار جو اپنے جاہ وجلال اور آرام وآسائش کے لمحات میں خدا کا نام تک لینے سے انکار کرتے تھے، جب اپنی قدرت کی بنیادوں کو متزلزل ہوتے اور اپنی ہستی کے محلوں کو گرتے دیکھتے تھے تو اس عظیم مبدأ(خدا) کی طرف متوجہ ہوتے تھے اور فطری آواز کو واضح طور پر سنتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے: جب فرعون نے اپنے آپ کو پر تلاطم لہروں کی لپیٹ میں پایا اور اس نے مشاہدہ کیا کہ جو پانی اس کے ملک کی آبادی اور زندگی کا سبب اور اس کی تمام مادی طاقت کا سر چشمہ تھا، اس وقت اس کے لئے موت کا حکم جاری کر رہا ہے اور وہ چند چھوٹی لہروں کے مقابلہ میں بے بس ہو کر رہ گیا ہے اور ہر طرف سے اس پر ناامیدی چھائی ہوئی ہے، تو اس نے فریاد بلند کی: "میں اس وقت اعتراف کرتا ہوں کہ موسیٰ کے خدا

کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔" حقیقت میں یہ فریاد اس کی فطرت اور روح کی گہرائیوں سے بلند ہوئی تھی نہ صرف فرعون بلکہ وہ تمام لوگ جو ایسے حالات سے دوچار ہوجاتے ہیں، اس آواز کو واضح طور پر سنتے ہیں۔

۴۔ خود آپ بھی اگر اپنے دل کی گہرائیوں پر توجہ کریں گے تو ضرور تائید کریں گے کہ وہاں پر ایک نور چمکتا ہے جو تمھیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہے۔ شاید زندگی میں آپ کو کئی بار نا قابل برداشت حوادث اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہو اور تمام مادی وسائل ان مشکلات کو دور کرنے میں ناکام ہوگئے ہوں، ان لمحات کے دوران آپ کے ذہن میں یہ حقیقت ضرور اجاگر ہوئی ہوگی کہ اس کائنات میں ایک بڑی اور قدرتمند طاقت موجود ہے جو اس مشکل کو آسانی کے ساتھ حل کرسکتی ہے۔

ان لمحات میں آپ کی امید پروردگار کی عشق سے ممزوج ہوکر آپ کی روح وجان کو اپنی آغوش میں لیتی ہے اور یاس وناامیدی کو آپ کے دل سے دور کردیتی ہے۔

جی ہاں! یہ نزدیک ترین راستہ ہے کہ ہر شخص اپنی روح کے اندر پروردگار عالم اور خالق کائنات کو پاسکتا ہے۔

ایک سوال

ممکن ہے آپ میں سے بعض افراد یہ سوال کریں کہ کیا یہ احتمال نہیں ہے کہ ہم ماحول اور اپنے والدین سے حاصل کی گئی تعلیمات کے زیر اثر حساس مواقع پر ایسا سوچتے ہیں؟ اور خدا کی بارگاہ میں ہاتھ پھیلاتے ہیں؟

ہم اس سوال کے بارے میں آپ کو حق بجانب جانتے ہیں اور ہمارے پاس اس کا ایک دلچسپ جواب ہے، جسے ہم آئندہ سبق میں بیان کریں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰىهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ﴿٦٥﴾ (سورۂ عنکبوت/ ٦٥)

"پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان وعقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں پھر جب وہ نجات دے کر خشکی تک پہنچ دیتا ہے تو فوراً شرک اختیار کر لیتے ہیں۔"

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کوشش کر کے مذکورہ آیہ کریمہ کو آیت اور سورہ کے نمبر اس کے ترجمہ کے ساتھ لفظ بہ لفظ یاد کیجئے اور بتدریج زبان قرآن سے آگاہی حاصل کیجئے۔

۲۔کیا آپ کو کبھی کوئی ایسا مشکل حادثہ پیش آیا ہے کہ آپ ہر طرف سے مایوس ہو چکے ہوں اور صرف پروردگار کے لطف کی امید باقی رہی ہو؟ (ایک مختصر مقالہ یا تقریر کے ذریعہ اس کو بیان کیجئے)۔

۳۔اس راستہ کو ہم نے کیوں نزدیک ترین راستہ کہا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

چوتھا سبق ایک اہم سوال کا جواب

سوال

گزشتہ سبق میں ہم یہاں تک پہنچے تھے کہ ہم توحید اور خدا پرستی کی آواز کو اپنی روح کے اندر سے سنتے ہیں، خاص کر مشکلات اور مصیبتوں کے وقت یہ آواز قوی تر ہوجاتی ہے اور ہم بے ساختہ طور پر خدا کو یاد کر کے اس کی لامحدود قدرت اور لطف و محبت سے مدد مانگتے ہیں۔

یہاں پر ممکن ہے یہ سوال پیش کیا جائے کہ یہ اندرونی آواز، جسے ہم فطرت کی آواز کہتے ہیں، ان تبلیغات کا نتیجہ ہو جو معاشرہ کے ماحول، مکتب و مدرسہ اور ماں باپ سے ہم سنتے ہیں اور یہ ہمارے لئے ایک قسم کی عادت بن گئی ہے۔

جواب

اس اعتراض کا جواب ایک مختصر سے مقدمہ کے ذریعہ واضح ہوجاتا ہے۔

عادتیں اور رسم و رواج، متغیّر اور ناپائیدار چیزیں ہیں۔ یعنی ہم کسی عادت اور رسم و رواج کو پیدا نہیں کر سکتے ہیں جو پوری تاریخ بشر کے دوران تمام اقوام میں یکساں صورت میں باقی رہے ہوں۔ جو مسائل آج عادت اور رسم و رواج کے طور پر رونما ہوتے ہیں، ممکن ہے کل بدل جائیں۔ اسی وجہ سے ممکن ہے ایک قوم کے رسم و رواج اور عادات دوسری قوموں میں نہ پائے جائیں۔

اس لئے اگر ہم مشاہدہ کریں کہ ایک چیز تمام قوموں اور ملتوں کے درمیان ہر زمان و مکان میں بلا استثناء موجود ہے تو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ اس کی ایک فطری بنیاد ہے جو انسان کی روح و جان کی ساخت اور بناوٹ میں قرار پائی ہے۔

مثال کے طور پر ایک ماں کی اپنے فرزند کی نسبت محبت کو کسی تلقین، تبلیغ عادت و رسم و رواج کا نتیجہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ ہم کسی قوم و ملت اور کسی زمان و مکان میں نہیں پاتے ہیں کہ ایک ماں اپنی اولاد سے محبت نہیں کرتی ہو۔

البتہ ممکن ہے ایک ماں نفسیاتی بیماری کی وجہ سے اپنے فرزند کو نابود کر دے یا کوئی باپ جاہلیت

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کے زمانہ میں غلط اور خرافی تفکر کی وجہ سے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کردے، لیکن یہ انتہائی شاذ و نادر اور استثنائی مواقع ہیں، جو جلدی ہی ختم ہوکر اپنی اصلی حالت (یعنی فرزند سے محبت) پر لوٹ آتے ہیں۔

مذکورہ تمہید کے پیش نظر ہم آج کے اور ماضی کے انسانوں کی خدا پرستی کے مسئلہ پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

(چونکہ یہ سبق قدرے پیچیدہ ہے اس لئے اس پر زیادہ غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے)

۱۔عمرانیات کے ماہرین اور بڑے بڑے مورخین کی گواہی کے مطابق ہم کسی ایسے زمانے کو نہیں پاتے ہیں جس میں مذہب اور مذہبی ایمان لوگوں میں موجود نہ رہا ہو بلکہ ہر عصر اور ہر زمانے میں دنیا میں ہر جگہ کسی نہ کسی صورت میں مذہب موجود تھا اور یہ بذات خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خدا پرستی کا سرچشمہ انسان کی روح و فطرت کی گہرائیوں میں موجود ہے نہ یہ کہ عادات، رسم ورواج اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہے۔اس لئے کہ اگر یہ عادات، رسم ورواج اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہوتا تو اس صورت میں اسے عام اور لافانی نہیں ہونا چاہئے تھا۔

یہاں تک کہ ایسے آثار و قرائن بھی موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل تاریخ میں زندگی بسر کرنے والے لوگ بھی ایک قسم کے مذہب کے قائل تھے (ماقبل تاریخ کا زمانہ اس زمانہ کو کہتے ہیں کہ ابھی لکھائی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور انسان اپنی یادگار کے طور پر تحریر نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

البتہ اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ چونکہ ابتدائی لوگ خدا کو ایک مافوق طبیعی وجود کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتے تھے اس لئے اسے مادی مخلوقت کے درمیان تلاش کرتے تھے اور اپنے لئے مادی مخلوقات سے بت بناتے تھے۔لیکن انسان نے عقل و فکر کی ترقی کے ساتھ رفتہ رفتہ حق کو پہچان لیا اور مادی مخلوقات کے بنائے ہوئے بتوں کو چھوڑ کر طبیعی کائنات کے ماوراء خدا کی لامحدود قدرت سے آگاہ ہوا۔

۲۔بعض ماہرین نفسیات نے صراحتاً کہا ہے کہ انسان کی روح کے چار پہلو یا چار اصلی حس پائے جاتے ہیں:

ا۔"دانائی کی حس": یہ حس انسان کو علم و دانش حاصل کرنے کی ترغیب دیتی ہے اور اس کی روح کو علم حاصل کرنے کا شوق دلاتی ہے، خواہ یہ علم اس کے لئے مادی فائدہ رکھتا ہو یا نہ ہو۔

ب۔"بھلائی کی حس" یہ حس عالم بشریت میں اخلاقی اور انسانی مسائل کا سرچشمہ ہے۔

ج۔"زیبائی کی حس": یہ حس، حقیقی معنی میں شعر، ادبیات اور فنّ و ہنر کا سرچشمہ ہے۔

د۔"مذہبی حس": یہ حس، انسان کو معرفت خدا اور اس کے فرمان کی اطاعت کرنے کی دعوت دیتی

ہے۔اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی حس انسانی روح کی ایک بنیادی اور اصلی حس ہے۔یعنی یہ حس نہ کبھی اس سے جدا تھی اور نہ کبھی جدا ہوگی۔

۳۔آئندہ بحثوں میں ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ اکثر مادہ پرست اور منکرین خدا نے بھی ایک طرح سے خدا کے وجود کا اعتراف کیا ہے،اگر چہ وہ لوگ خدا کے نام لینے سے پرہیز کرتے ہیں اور اسے فطرت یا دوسرے نام سے پکارتے ہیں ،لیکن اس فطرت کے لئے ایسی صفتوں کے قائل ہوتے ہیں کہ جو خدا کی صفات کے مشابہ ہیں۔

مثلاً کہتے ہیں:فطرت نے اگر انسان کو دو گردے دئے ہیں،یہ اس لئے ہے کہ اسے معلوم تھا،ممکن ہے ان دو گردوں میں سے ایک خراب ہوجائے تو دوسرا گردہ اس کی زندگی کو جاری رکھ سکے،وہ ایسی ہی تعبیرات بیان کرتے ہیں۔کیا یہ بات ایک بےشعور فطرت کے ساتھ متناسب ہے؟یا یہ کہ یہ ایک ایسے خداوند متعال کی طرف اشارہ ہے جو لامحدود علم وقدرت کا مالک ہے،اگر چہ انہوں نے اس کا نام فطرت رکھا ہے۔

بحث کا نتیجہ:اس بحث میں جو کچھ ہم نے بیان کیا،اس سے یہ نتیجہ حاصل کرتے ہیں:

خدا کی محبت ہماری روح میں ہمیشہ موجود تھی اور ہوگی۔

خدا کا ایمان ایک ایسا ابدی شعلہ ہے جو ہمارے قلب وروح کو گرم کرتا ہے۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے لئے ہم مجبور نہیں ہیں کہ طولانی راستے طے کریں،ہمیں اپنے وجود کی گہرائیوں میں نظر ڈالنی چاہئے،خدا پر ایمان کو ہم وہاں پر پائیں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۝١٦ (سورۂ ق/١٦)

"اور ہم اس سے رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

١۔عادت کی چند مثالیں اور فطرت کی چند مثالیں بیان کیجئے۔

٢۔نادان لوگ کیوں بت پرستی کے پیچھے جاتے تھے؟

٣۔مادہ پرست خدا کو کیوں "فطرت" کے نام سے یاد کرتے ہیں؟

پانچواں سبق: ایک سچا واقعہ

ہم نے بیان کیا کہ زبان سے خدا کا انکار کرنے والے بھی اپنی روح کی گہرائیوں میں خدا کے وجود کا ایماب رکھتے ہیں۔

بیشک کامیاں بیاں۔خاص کر کم ظرف لوگوں کے لئے۔غرور پیدا کرتی ہیں اور یہی غرور، فراموشی کا سبب بنتا ہے، یہاں تک کہ کبھی انسان اپنی فطرت کو بھی بھول جاتا ہے۔لیکن جب حوادث کے طوفان اس کی زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں اور مشکلات کی تند و تیز آندھیاں ہر طرف سے اس پر حملے کرتی ہیں ،تو اس کی آنکھوں کے سامنے سے غرور و تکبر کے پردے ہٹ جاتے ہیں اور توحید و معرفت خدا کی فطرت نمایاں ہو جاتی ہے۔

تاریخ بشر اس قسم کے افراد کے بہت سے نمونے پیش کرتی ہے،مندرجہ ذیل واقعہ ان میں سے ایک ہے:

ایک شخص اپنے زمانے کا مقتدر اور قوی وزیر تھا، اکثر عہدوں کو اپنے قبضہ میں لے چکا تھا، کوئی اس کی مخالفت کی جرئت نہیں کرتا تھا۔ایک دن یہ وزیر ایک ایسی مجلس میں داخل ہوا جہاں پر دینی علماء بیٹھے تھے ۔اس نے ان سے مخاطب ہو کر کہا تم لوگ کب تک کہتے رہو گے کہ کائنات میں کوئی خدا ہے، میں اس کی نفی میں ہزار دلیلیں پیش کر سکتا ہوں۔

اس نے اس جملہ کو ایک خاص غرور و تکبر کے ساتھ ادا کیا۔مجلس میں موجود علماء چونکہ جانتے تھے کہ وہ اہل منطق واستلال نہیں ہے اور اقتدار نے اسے اس قدر مغرور کر دیا ہے کہ کوئی حق بات اس پر اثر انداز نہیں ہو سکتی ہے، اس لئے انہوں نے بے اعتنائی کے ساتھ ایک بامعنی اور حقارت آمیز خاموشی اختیار کی۔

یہ واقعہ گزر گیا، ایک مدت کے بعد وزیر پر الزام لگایا گیا اور وقت کی حکومت نے اسے گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔

ان علماء میں سے ایک عالم جو اس دن اس مجلس میں موجود تھا، اس نے سوچا کہ اس شخص کی بیداری کا وقت آ گیا ہے، اب جبکہ اس کا غرور ٹھنڈا ہو چکا ہے اور خود پرستی کے پردے اس کی آنکھوں سے ہٹ گئے ہیں اور حق کو قبول کرنے کی حس اس میں پیدا ہو گئی ہے اگر اب اس سے رابطہ قائم کیا جائے اور اس کی نصیحت

کی جائے تو سودمند ہوگی۔اس عالم دین نے اس شخص سے ملاقات کی اجازت حاصل کی اوراس سے ملاقات کرنے کے لئے جیل گیا۔ جوں ہی وہ اس شخص کے نزدیک پہنچا تو لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اسے ایک کمرہ میں اکیلا پایا۔ وہ ٹہلتے اورسوچتے ہوئے کچھ اشعار گنگنارہا تھا، عالم دین نے غور سے سنا تو دیکھا وہ یہ معروف اشعار پڑھ رہا تھا:

ماہمہ شیران ولی شیر علم حملہ مان ازبا دبا شدد م بدم!

حملہ مان پیدا ونا پیدا ست باد جان فدای آن کہ نا پیدا ست باد!

یعنی ہماری مثال ان شیروں کے مانند ہے جو جھنڈوں پر نقش کئے جاتے ہیں، جب ہوا چلتی ہے تو وہ حرکت میں آتے ہیں گویا وہ حملہ کرتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ کچھ نہیں ہیں بلکہ یہ ہوا کا چلنا ہے جو اسے قدرت بخشتا ہے، ہم بھی جس قدر طاقتور ہو جائیں یہ طاقت ہماری اپنی نہیں ہے۔ جس خدا نے ہمیں یہ طاقت دی ہے، وہ جب چاہے ہم سے واپس لے لے۔

مذکورہ عالم دین نے دیکھا کہ ان حالات میں نہ صرف یہ خدا کا منکر نہیں ہے بلکہ ایک شدید خداشناس بن گیا ہے۔ اس سے حال واحوال پوچھنے کے بعد کہا: یاد ہے ایک دن تم نے کہا تھا: خدا کی نفی میں ہزار دلائل پیش کرسکتا ہوں میں اس وقت اس لئے آیا ہوں کہ تمھارے ہزار دلائل کا ایک جواب دوں: خداوند متعال وہ ہے جس نے تم سے اس عظیم اقتدار کو اس آسانی کے ساتھ چھین لیا، اس نے اپنا سر نیچا کرلیا اور شرمندہ ہوگیا اور کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ اس نے اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا تھا اور وہ اپنی روح کے اندر خدا کے نور کا مشاہدہ کررہا تھا۔

قرآن مجید فرعون کے بارے میں فرماتا ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ (سورۂ یونس/ ۹۰)

"یہاں تک کہ غرقابی نے اسے (فرعون کو) پکڑ لیا تو اس نے آواز دی کہ میں اس خدائے وحدہ لاشریک پر ایمان لے آیا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ مذکورہ سچے واقعہ کو چند سطروں میں بیان کیجئے۔
۲۔ بنی اسرائیل کو کیوں بنی اسرائیل کہتے ہیں؟
۳۔ فرعون کون تھا، کہاں زندگی بسر کرتا تھا اور اس کا دعویٰ کیا تھا؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

معرفت خدا کے دس سبق

چھٹا سبق: خدا کی معرفت کا دوسرا راستہ

ب۔ بیرونی راستہ

ہم جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اس حقیقت تک پہنچتے ہیں کہ کائنات درہم برہم نہیں ہے بلکہ تمام موجودات ایک معیّن راہ پر

گامزن ہیں اور کائنات کا نظم ایک بڑی فوج کے مانند ہے جو مختلف اور منظم یونٹوں میں تقسیم ہو کر ایک معین مقصد کی طرف بڑھ رہا ہے۔

مندرجہ ذیل نکات اس سلسلہ میں ہر شبہہ کو دور کر سکتے ہیں:

ا۔ ہر زندہ مخلوق کے وجود میں آنے اور باقی رہنے کے لئے ضروری ہے کچھ خاص قوانین اور حالات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے پائے جائیں ۔مثلاً ایک درخت کے وجود میں آنے کے لئے: زمین، مناسب آب وہوا اور ایک معیّن دھوپ اور گرمی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ بیج کو ڈالا جائے اور وہ اچھی طرح سے غذا حاصل کرے، تنفس کرے، سبز ہو جائے اور نشو ونما پائے۔

ان حالات کے بغیر اس کی نشو ونما ممکن نہیں ہے، ان حالات کو منتخب کرنے اور ان مقدمات کو فراہم کرنے کے لئے عقل اور علم ودانش کی ضرورت ہے۔

۲۔ ہر مخلوق کا اپنا ایک خاص اثر ہوتا ہے، پانی اور آگ میں سے ہر ایک کا اپنا خاص اثر ہے، جو ان سے کبھی جدا نہیں ہوتا ہے بلکہ ہمیشہ ایک ثابت اور پائدار قانون کی پیروی کرتا ہے۔

۳۔زندہ مخلوقات کے تمام اعضاء آپس میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں مثال کے طور پر یہی انسان کا بدن جو بذات خود ایک عالم ہے، عمل کے وقت اس کے تمام اعضاء شعوری اور لاشعوری طور پر ایک خاص ہماہنگی سے کام کرتے ہیں ۔مثال کے طور پر اگر کسی خطرہ سے دو چار ہو جائے تو تمام اعضاء دفاع

کے لئے متحد ہوجاتے ہیں۔ یہ نزدیک رابطہ اور تعاون، کائنات کے نظم کی ایک اور علامت ہے۔

۴۔ کائنات پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ نہ صرف ایک زندہ مخلوق کے اعضاء وجسم بلکہ کائنات کی تمام مخلوقات بھی آپس میں ایک خاص ہماہنگی رکھتی ہیں۔ مثلاً زندہ مخلوقات کی نشو ونما کے لئے سورج چمکتا ہے، بادل برستا ہے، ہوا چلتی ہے، زمین اور زمین کے منابع اس کی مدد کرتے ہیں۔ یہ کائنات میں ایک معین نظام کے وجود کی نشانیاں ہیں۔

"نظم وضبط" اور "عقل" کا رابطہ

یہ حقیقت ہر انسان کے ضمیر پر واضح ہے کہ جہاں کہیں بھی نظم پایا جاتا ہو وہ "عقل، فکر، نقشہ اور مقصد" کی دلیل ہے۔

کیونکہ انسان جہاں کہیں بھی ایک ثابت نظم وضبط اور قوانین کا مشاہدہ کرے وہ جانتا ہے کہ اس کے ساتھ ہی علم وقدرت کے ایک مبدا کی بھی تلاش اور جستجو کرنی چاہئے اور اپنے ضمیر کے اس ادراک میں کسی استدلال کی ضرورت کا احساس بھی نہیں کرتا ہے۔

وہ اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ایک اندھا اور ان پڑھ شخص ہرگز ایک ٹائپ مشین سے ایک اچھا مضمون یا ایک اجتماعی وتنقیدی مقالہ نہیں لکھ سکتا ہے، اور ایک دوسال کا بچہ کاغذ پر نامنظم صورت میں قلم چلا کر ہرگز ایک اچھی اور گراں قیمت نقاشی نہیں کر سکتا ہے۔ بلکہ اگر ہم ایک اچھا مضمون یا گراں قیمت مقالہ دیکھتے ہیں تو جانتے ہیں کہ ایک تعلیم یافتہ اور عقل وشعور والے کسی شخص نے اسے لکھا ہے، یا اگر کسی نمائش گاہ میں نقاشی کا ایک اچھا نمونہ دیکھتے ہیں تو اس بات میں شک وشبہہ نہیں کرتے ہیں کہ اسے ایک ہنرمند نقاش نے بنایا ہے، اگر چہ ہم نے کبھی اس ہنرمند نقاش کو نہ دیکھا ہو۔

اس لئے جہاں کہیں بھی نظم وضبط پایا جائے اس کے ساتھ عقل وہوش ضرور ہوگا اور یہ نظم جس قدر بڑا، دقیق تر اور دلچسپ ہوگا، جس علم وعقل نے اسے خلق کیا ہے وہ بھی اسی قدر بڑا ہوگا۔

بعض اوقات اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ ہر منظم چیز کے لئے عقل ودانش کے سرچشمہ کی ضرورت ہے، ریاضیات عالی میں ذکر شدہ "احتمالات کے حساب" سے مدد لی جاتی ہے اور اس طریقہ سے ثابت کرتے ہیں کہ مثلاً ایک ان پڑھ شخص اگر ٹائپ مشین کے ذریعہ اتفاقی طور پر مشین کے بٹن دبانے سے ایک مقالہ یا چند اشعار کو لکھنا چاہے تو "احتمالات کے حساب" کے مطابق اس میں اربوں سال لگ جائیں گے

کہ حتی کرہٴ زمین کی پوری عمر بھی اس کے لئے کافی نہیں ہوگی۔(اس کی مزید وضاحت کے لئے کتاب" آفرید گار جہان" یا کتاب" درجستجو خدا" کا مطالعہ فرمائیں)

قرآن مجید فرماتا ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ (سورہ فصلت/ ۵۳)

"ہم عنقریب اپنی نشانیوں کو تمام اطراف عالم میں اور خود ان کے نفس کے اندر دکھلائیں گے تا کہ ان پر یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ برحق ہے اور کیا تمھارے پروردگار کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے۔ کہ وہ ہر شے کا گواہ اور سب کا دیکھنے والا ہے۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔صنعتی کارخانوں کی چند مثالیں (سبق میں بیان کی گئی مثال کے علاوہ) پیش کیجئے، جن کے مشاہدہ سے خالق کائنات کے وجود کا علم حاصل ہوجائے۔

۲۔" آفاق" اور "انفس" میں کیا فرق ہے؟ آفاق اور انفس میں خدا کی نشانیوں کی چند مثالیں بیان کیجئے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ساتواں سبق: نظام خلقت کے چند نمونے

پوری کائنات میں "نظم"، "مقصد" اور "نقشہ" کو واضح طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔اب توجہ فرمایئے کہ ہم ان کے چند نمونوں کو بیان کرتے ہیں:

ہم نے یہاں پر آپ کے لئے چند چھوٹے بڑے نمونے اکٹھا کئے ہیں۔

خوش بختی سے آج طبیعی علوم میں ترقی کے نتیجہ میں عالم طبیعت میں انسان، حیوان، پودوں، خلیوں اور ایٹم کی حیرت انگیز عمارت کی باریک بینیوں اور ستاروں کے حیرت انگیز نظام نے ہم پر معرفت خدا کے دروازے کھول دئے ہیں۔اس لئے جرأت کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ طبیعی علوم کی تمام کتابیں توحید اور معرفت خدا کی کتابیں ہیں، جو ہمیں عظمت پروردگار کا درس دیتی ہیں، کیونکہ یہ کتابیں کائنات کی مخلوقات کے دلکش نظام سے پردہ اٹھاتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ خالق کائنات کس قدر عالم وقادر ہے۔

ملک بدن کی حکمرانی کا مرکز

ہماری کھوپڑی کے اندر خاکی رنگ کا ایک مادہ ہے، جسے ہم مغز کہتے ہیں۔یہ مغز ہمارے بدن کے اہم ترین اور دقیق ترین حصہ کو تشکیل دیتا ہے، کیونکہ اس کا کام بدن کے تمام قوا کو فرمان جاری کرنا اور ہمارے جسم کے تمام اعضاء کو کنٹرول کرنا ہے۔اس عظیم مرکز کی اہمیت کو بیان کرنے کے لئے مناسب ہے پہلے آپ کے لئے یہ خبر بیان کریں:

جرائد میں یہ خبر نقل کی گئی تھی کہ ایک شیرازی طالب علم کو خوزستان میں ایک ٹریفک حادثہ کے نتیجہ میں مغز پر چوٹ لگ گئی تھی، بظاہر وہ سالم نظر آتا تھا۔لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی تمام یادداشتیں کھو بیٹھا تھا۔اس کا دماغ بخوبی کام کرتا تھا۔مطالب کو سمجھتا تھا،لیکن اگر اپنے ماں یا باپ کو دیکھتا تو انھیں نہیں پہچانتا تھا۔جب اس سے کہتے تھے کہ یہ تمھاری ماں ہے، وہ تعجب کرتا تھا۔اسے اپنے گھر شیراز لے جایا گیا اور اس کی دستکاری۔۔جو اس کے کمرہ کی دیوار پر نصب تھی۔۔اسے دکھائی گئی تو وہ تعجب سے ان پر نگاہ کرنے کے بعد کہتا تھا کہ میں انھیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔

معلوم ہوا کہ اس مغزی چوٹ کے نتیجہ میں اس کے دماغ کی خلیوں کا ایک حصہ، جو حقیقت میں فکر اور حافظہ کے مخزن کے درمیان رابطہ کے تار کا رول ادا کرتا ہے، بیکار ہوا ہے اور جیسے بجلی کا فیوز اڑ جانے کے نتیجہ میں بجلی منقطع ہو کر تاریکی پھیل جاتی ہے، اسی طرح اس کی سابقہ یادوں کا ایک بڑا حصہ فراموشی کی تاریکی میں ڈوب گیا ہے۔

شایداس کے مغز کا بیکار شدہ حصہ ایک پن کی نوک سے زیادہ نہیں ہوگا،لیکن اس نے اس کی زندگی پر کس قدر اثر ڈالا ہے!اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے مغز کا سسٹم کس قدر پیچیدہ ہےاوراہم ہے۔

مغز واعصاب کا سلسلہ دو اہم حصوں سے تشکیل پاتا ہے:

ا۔ارادی اعصاب: ہمارے بدن کے تمام اختیاری حرکات، جیسے: راہ چلنے دیکھنے، باتیں کرنے و....کا سرچشمہ اعصاب کا یہی حصہ ہے۔

۲۔غیر ارادی اعصاب: اعصاب کا یہ حصہ،دل کی دھڑکن،معدہ وغیرہ جیسے اعضاء کا کنٹرول کرتا ہے۔مغز کے اس حصہ کا ایک ذرہ بیکار ہونے کے نتیجہ میں ممکن ہے انسان کا قلب یا کوئی دوسرا عضو مختل ہوکررہ جائے۔

دماغ کاایک عجیب وغریب حصہ:

"مخ"(بھیجا) دماغ کا وہ چھوٹا حصہ ہے جو دماغ کے دوحصوں کے درمیان واقع ہے،مغز کا یہ بالکل چھوٹا حصہ ہوش،ارادہ اورشعور کا مرکز ہے۔یہ مغز کا ایک اہم ترین حصہ ہے بہت سے جذباتی ردعمل ،جیسے غضب اورترس وغیرہ اسی سے مربوط ہیں۔

اگرکسی جانور کا"مخ"الگ کر دیا جائے،لیکن اس کے باقی اعصاب اپنی جگہ پر صحیح وسالم ہوں تو وہ جانور زندہ رہتا ہےلیکن فہم وشعور کو بالکل ہی کھودیتا ہے۔ایک کبوتر کا"مخ"نکالا گیا۔وہ ایک مدت تک زندہ رہا۔لیکن جب اس کے سامنے دانہ ڈالتے تھے وہ اسے تشخیص نہیں دے سکتا تھااور بھوکا ہونے کے باوجوداسے نہیں کھاتا تھا۔اگراسے اڑاتے تھے،تو وہ پرواز ہی کرتا رہتا تھا، یہاں تک کہ کسی چیز سے ٹکرا کرگر جاتا تھا۔

دماغ کاایک اورحیرت انگیز حصہ،"حافظہ"ہے۔

کیا آپ نے اس پرغورکیاہے کہ ہماراقوہٴ حافظہ کس قدرحیرت انگیز ہے؟اگرایک گھنٹہ کے لئے ہم سے حافظہ چھین لیا جائے تو ہم کس مصیبت سے دوچار ہوجائیں گے؟!

حافظہ کامرکز،جوہمارے دماغ کاایک چھوٹا حصہ ہے،ہماری پوری عمرکی یادوں کوتمام خصوصیات کے ساتھ ریکارڈ کرتا ہے۔جس شخص نے بھی ہم سے رابطہ قائم کیا ہو،اس کی تمام خصوصیات جیسے،قد،شکل وصورت،رنگ ،لباس،اخلاق اورجذبات کوریکارڈ کرکے محفوظ رکھتاہےاور ہرایک کے لئے ایک الگ فائل تشکیل دیتاہے۔لہذاجوں

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ہی ہم اس شخص سے روبرو ہوتے ہیں، ہماری فکر تمام فائلوں میں سے اس شخص کی فائل کو نکال کر فوری طور پر اس کا مطالعہ کرتی ہے۔اس کے بعد ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم اس کے مقابلہ میں کون سا ردعمل ظاہر کریں۔

اگر وہ دوست ہے تو اس کا احترام کریں اور اگر دشمن ہے تو اظہار نفرت کریں۔لیکن یہ تمام کام اس قدر سرعت کے ساتھ انجام پاتے ہیں کہ وقت کے ذرا سا بھی فاصلہ کا احساس تک نہیں ہوتا۔

اس مسئلہ پر تعجب اس وقت اور زیادہ ظاہر ہوتا ہے جب ہم اپنے حافظ میں موجود چیزوں کو تصویر کے ذریعہ کاغذ پر ترسیم کرنا چاہیں یا انھیں کیسٹ میں ضبط کرنا چاہیں تو ہم بیشک کاغذ اور کیسٹ کی بڑی تعداد کو مصرف میں لاتے ہیں جو ایک انبار کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔عجیب تر یہ ہے کہ ان کیسٹوں اور کاغذات میں سے ایک کو باہر نکالنے کے لئے ہمیں بہت سے مامورین کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، جبکہ ہمارا حافظہ ان تمام کاموں کو آسانی کے ساتھ فی الفور انجام دیتا ہے۔

بے شعور طبیعت کیسے باشعور چیزوں کی تخلیق کر سکتی ہے؟

انسان دماغ کے عجائبات کے بارے میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بعض کا کالجوں اور یونیورسٹیوں کی کتابوں میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔کیا اس پر باور اور یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ غیر معمولی، انوکھا، دقیق، پیچیدہ اور پر اسرار دماغ کسی بے شعور طبیعت کی تخلیق ہوگی؟ اس سے بڑھ کر کوئی بات تعجب انگیز نہیں ہو سکتی ہے کہ ہم بے عقل طبیعت کو عقل کا خالق جانیں!

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ (ذاریات/۲۱)

"خود تمھارے اندر بھی (خدا کی عظمت اور قدرت کی بڑی نشانیاں ہیں) کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو؟"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کیا آپ انسانی دماغ کے عجائبات کے بارے میں کچھ اور مطالب جانتے ہیں؟

۲۔خداوند متعال نے گونا گون حوادث کے مقابلہ میں انسانی دماغ کے تحفظ کے لئے کون سی تدبیریں کی ہیں؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

آٹھواں سبق:

ایک چھوٹے سے پرندے میں حیرت انگیز دنیا

چمگادڑ اور اس کی عجیب خلقت

اس درس میں ہم اپنے بدن کے عظیم ملک سے ۔۔ کہ ہم نے اس کے سات شہروں میں سے ایک گلی کی بھی سیر نہیں کی ہے ۔۔ باہر آکر تیزی کے ساتھ ادھر اُدھر گھوم پھر کر مخلوقات کے حیرت انگیز نظام کے چند نمونے اکٹھا کریں گے:

ہم رات کی تاریکی میں آسمان پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ ہم ظلمت کے پردوں کے درمیان ایک غیر معمولی پرندے کو پراسرار سایہ کی صورت میں دیکھتے ہیں جو پوری شجاعت کے ساتھ اپنی غذا حاصل کرنے کے لئے ہر طرف پرواز کر رہا ہے۔

یہ پرندہ وہی "چمگادڑ" ہے، جس کی ہر چیز عجیب ہے۔ لیکن رات کی تاریکی میں اس کی پرواز عجیب تر ہے۔

اندھیری رات میں چمگادڑ کا انتہائی سرعت کے ساتھ پرواز کرنا اور کسی چیز سے اس کا نہ ٹکرانا اس قدر تعجب انگیز ہے کہ جتنا بھی اس پر غور کیا جائے اس پراسرار پرندہ کے بارے میں نئے نئے اسرار معلوم ہوتے ہیں۔

یہ پرندہ رات کی تاریکی میں اسی سرعت و شجاعت کے ساتھ پرواز کرتا ہے کہ جیسے ایک تیز اڑنے والا کبوتر دن کے اجالے میں پرواز کرتا ہے۔ یقیناً اگر اس پرندہ میں مانع کے بارے میں اطلاع دینے کا کوئی وسیلہ نہ ہوتا تو بڑی احتیاط سے اور آہستہ آہستہ پرواز کرتا۔

اگر اس پرندہ کو ایک تنگ و تاریک اور پر پیچ وخم اور سیاہی سے بھرے ٹنل (سرنگ) میں چھوڑ دیا جائے تو وہ تمام پیچ وخم سے گزر جاتا ہے بغیر اس کے کہ ایک بار بھی ٹنل کی دیوار سے ٹکرائے اور ایک ذرہ سیاہی بھی اس کے پروں پر بیٹھے چمگادڑ کی یہ عجیب حالت اس کے وجود میں پائی جانے والی خاصیت کے

سبب ہے جوکہ راڈار کی خاصیت کے مانند ہے۔

یہاں پر ہمیں راڈار کے بارے میں تھوڑی سی آگاہی حاصل کرنی چاہیئے تا کہ ہمیں اس چھوٹے سے چمگادڑ میں اس راڈار کی حالت معلوم ہوجائے۔

علم فزیکس میں آواز کے سلسلہ میں ماورائے صوت کی امواج کے بارے میں ایک بحث ہے۔ یہ وہی امواج ہیں جن کا وقفہ اورطول اس قدر زیادہ ہے کہ انسان کے کان اسے درک کرنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں، اسی لئے انھیں ماورائے صوت کہتے ہیں۔

جب اس قسم کی امواج کوایک قوی ٹرانسمیٹر کے ذریعہ ایجاد کیا جاتا ہے، تو یہ امواج ہرطرف پھیلتی ہیں۔ لیکن جوں ہی فضا میں کسی جگہ پر کسی رکاوٹ (دشمن کے جہاز یا کسی اور مانع) سے ٹکراتی ہیں ایک فٹ بال کے دیوار سے ٹکرانے کے مانند واپس پلٹتی ہیں بالکل اسی طرح کہ جب ہم ایک اونچے پہاڑ یا دیوار کے سامنے آواز بلند کرتے ہیں تو اس آواز کی گونج پہاڑ یا دیوار سے ٹکرا کر واپس لوٹتی ہے۔ ان امواج کی باز گشت کی مدت کے مطابق اس مانع کے فاصلہ کا صحیح انداز کیا جا سکتا ہے۔

بہت سے ہوائی جہازوں اور کشتیوں کو راڈرار کے ذریعہ سے ہی ہدایت کی جاتی ہے جہاں کہیں بھی وہ جانا چاہیں۔ اسی طرح دشمن کے ہوائی جہاز اور کشتیوں کو معلوم کرنے کے لئے بھی راڈار سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اس چھوٹے سے پرندہ میں راڈار کے مانند ایک مشین موجود ہے۔ اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ اگر چمگادڑ کوایک بند کمرے میں پرواز کرائیں اوراسی لمحہ ماورائے صوت کی امواج کو سننے کے قابل امواج میں تبدیل کرنے والے ایک مائیکروفون کو کمرہ میں رکھا جائے تو پورے کمرہ میں ایک نامفہوم گوش خراش آواز پھیل جائے گی اور ہر سیکنڈ میں ۳۰ سے ۶۰ مرتبہ ماورائے صوت کی امواج چمگادڑ سے سنی جائیں گی۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ چمگادڑ کے کس عضو سے یہ امواج پیدا ہوتی ہیں یعنی اس کا ٹرانسمیٹر کون سا عضو ہے اور مائیکروفون کون سا عضو ہے؟

اس سوال کے جواب میں سائنسدان کہتے ہیں: یہ امواج چمگادڑ کے حلق کی نالی کے قوی پٹھّوں سے پیدا ہوتی ہیں اوراس کی ناک کے سوراخوں سے باہر نکلتی ہیں اوراس کے بڑے کان امواج کو حاصل کر

نے میں مائیکروفون کا کام انجام دیتے ہیں۔

اس لئے چمگادڑ اندھیری رات کی اپنی سیر و سیاحت کے دوران اپنے کانوں کا مرہون منت ہے۔"جورین" نامی ایک روسی سائنسدان نے تجربے سے ثابت کیا ہے کہ اگر چمگادڑ کے کان کاٹ دئے جائیں تو وہ تاریکی میں کسی مانع سے ٹکرائے بغیر پرواز نہیں کرسکتا ہے۔جبکہ اگر اس کی آنکھوں کو بالکل ہی نکال دیا جائے تو پھر بھی وہ پوری مہارت سے پرواز کرسکتا ہے،یعنی چمگادڑ اپنے کانوں سے دیکھتا ہے،نہ اپنی آنکھوں سے اور یہ ایک عجیب چیز ہے۔(توجہ کیجئے!!)

اب ذرا غور کیجئے کہ اس چھوٹے سے پرندہ کے اس نازک جسم میں ان دو عجیب اور حیرت انگیز مشینوں کو کس نے خلق کیا ہے اور ان سے استفادہ کرنے کے طریقہ کو کس نے اسے سکھایا ہے تا کہ اس اطمینان بخش وسیلہ کے ذریعہ رات کے وقت اپنی پرواز کے دوران بہت سے خطرات سے محفوظ رہ سکے؟واقعاً کس نے سکھایا ہے؟

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک بے شعور اور بے عقل طبیعت ایسا کام انجام دے سکے؟اور ایک ایسی مشین کو آسانی کے ساتھ اس پرندہ کے بدن میں قرار دے،جسے بڑے بڑے سائنسدان کافی رقومات خرچ کر کے بناتے ہیں؟

شاعر کہتا ہے:

شائستہ ستائش آن آفریدہ گاری

اس کارچنین دلاویز نقشی زماء وطینی

وہ خالق جہان ہی تعریف کے ہی لائق جو آب وگل دکش جہاں بنادے

امیرالمؤمنین علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں چمگادڑ کی خلقت کے بارے میں ایک مفصل خطبہ میں فرمایا ہے:

"لاتمتنع من المضی فیہ لغسق دجنتهفسبحان الباری لکل شیء علی غیر مثال"(خطبہ/١٥٥)

"وہ (چمگادڑ) شدید اندھیرے کی وجہ سے ہرگز اپنی راہ سے پیچھے نہیں ہٹتا ہے پاک ومنزّہ ہے وہ خدا جس نے کسی نمونہ کے بغیر ہر چیز کو خلق کیا ہے"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

ا۔ چمگادڑ کی خلقت کے بارے میں آپ کونسے مزید دلچسپ اطلاعات رکھتے ہیں؟

۲۔کیا آپ جانتے ہیں کہ چمگادڑ کے پر، بچے کی پرورش کا طریقہ اور یہاں تک کہ اس کا سونا دوسرے حیوانات سے متفاوت ہےیعنی یہ مکمل طور پر ایک استثنائی پرندہ ہے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاهور

نواں سبق: حشرات اور پھولوں کی دوستی!

موسم بہار میں ایک دن، جب ہوا رفتہ رفتہ گرم ہورہی ہو، سرسبز اور خوبصورت باغوں اور کھیتوں کی ایک سیر کیجئے۔ آپ وہاں پر چھوٹے چھوٹے حشرات، شہد کی مکھیاں، طلائی مکھیاں، تتلیاں اور چھوٹے چھوٹے مچھروں کو گروہوں کی صورت میں مشاہدہ کریں گے جو آہستہ آہستہ کسی قسم کے شور وغل کے بغیر ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں، ایک پھول سے اٹھ کر دوسرے پھول کی طرف پرواز کرتے ہیں ایک ٹہنی سے دوسری ٹہنی کی طرف اڑتے ہیں۔

یہ حشرات اس قدر سرگرم عمل ہیں کہ جیسے کوئی مرموز طاقت ایک منتظم کے مانند انھیں حکم دیتی ہے اور ایک کارخانہ میں وردی پوش مزدوروں کی طرح ان کے پروبال پھولوں کی زردی سے آغشتہ ہو کر مزدوروں کی شکل وصورت اختیار کر لیتے ہیں اور نہایت تندی اور لگن سے اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

حقیقت میں یہ ایک اہم ماموریت اور کام انجام دیتے ہیں۔ ان کی یہ ماموریت اس قدر عظیم ہے کہ پروفیسر رلسون برٹن اس سلسلہ میں کہتا ہے:

"بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ حشرات کے وجود کی بغیر ہمارے میوؤں کی ٹوکریاں خالی پڑی رہ جائیں گی"

ہم اس دانشور کے قول کے ساتھ اس جملہ کا اضافہ کرتے ہیں: "برسوں کے بعد ہمارے باغ اور لہلہاتے کھیت اس طراوت اور شادابی مکمل طور پر کھودیں گے۔" اس لئے حقیقت میں حشرات میوؤں کی پرورش کرنے والے اور پھولوں کے بیج مہیّا کرنے والے ہیں۔

آپ ضرور پوچھیں گے کیوں کر؟ اس لئے کہ پودوں کا حساس ترین حیاتی عمل یعنی عمل لقاح (fertilization) انہی حشرات کے ذریعہ انجام پاتا ہے۔ آپ نے ضرور یہ بات سنی ہوگی کہ بہت سے حیوانوں کے مانند پھولوں میں نر و مادہ پائے جاتے ہیں اور جب تک ان کے درمیان ملاپ اور پیوند کا کام انجام نہ پائے، بیج، دانہ اور ان کے نتیجہ میں میوہ حاصل نہیں ہوگا۔

لیکن کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ پودوں کے بے حس وحرکت مختلف حصے کس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جذب ہوتے ہیں اور نر پھولوں کی خلیہ، جو مرد کے نطفہ (sperm) کے حکم میں ہے، مادہ

پھولوں کی خیلہ سے، جو مادہ کے نطفہ ( ) کے حکم میں ہے، ملتی ہے اوران کے درمیان از دواج کے مقدمات فراہم ہوتے ہیں؟

یہ کام بہت مواقع پرحشرات کے ذریعہ انجام پاتا ہے اوربعض مواقع پر ہواؤں کے ذریعہ۔

لیکن یہ بات اتنی آسان نہیں ہے جیسا ہم خیال کرتے ہیں۔ یہ مبارک اور بابرکت نکاح جو حشرات کی خواستگاری سے انجام پاتا ہے۔اس کی ایک حیرت انگیز اورطولانی تاریخ ہے۔ یہاں پرہم اس کی ایک جھلک پیش کرتے ہیں:

دوقدیمی اورجگری دوست

علم طبیعت کے سائنسدان مطالعات وتحقیقات کے بعداس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ نباتات اور پھول زمین شناسی کے دوسرے دور کے دوسرے حصہ میں وجود میں آئے ہیں۔تعجب کی بات ہے کہ اسی دوران میں حشرات بھی وجود میں آئے ہیں اور یہ دونوں حوادث وواقعات سے پُرخلقت کی پوری تاریخ میں ہمیشہ دو وفاداراورجگری دوستوں کے مانندزندگی بسرکرتے ہوئے ایک دوسرے کے لازم وملزم رہے ہیں۔

پھولوں نے اپنے دائمی دوستوں کی محبت کوحاصل کرنے اوران کے دہن کوشرین کرنے کے لئے ایک بہت ہی لذیز مٹھائی کواپنے اندر ذخیرہ کیاہےاور جب حشرات نر پھولوں کی خلیہ کو پیونداورلقاح کے مقدمات مہیا کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لئے زحمت اٹھاتے ہوئے پھولوں کے اندر داخل ہوتے ہیں !تو پھول انھیں اس مٹھائی کومفت میں پیش کرتے ہیں، یہ مخصوص قندحشرات کے لئے اتنا میٹھااورلذیز ہوتاہے کہ انھیں بے اختیارا پنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

علم نباتات کے بعض ماہرین کا اعتقاد ہے کہ پھولوں کے خوبصورت رنگ اورخوشبوبھی حشرات کو اپنی طرف کھینچنے میں موثر ہیں۔شہد کی مکھیوں پر کئے گئے تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ وہ رنگوں کوتشخیص دیتی ہیں اور پھولوں کی خوشبوکودرک کرتی ہیں۔

حقیقت میں یہ پھول ہیں جوخودکوحشرات کے لئے سجاتے ہیں اورخوشبو پھیلاتے ہیں تاکہ بازوق تتلیوں اورنفاست پسندشہد کی مکھیوں کواپنی طرف کھینچ لیں۔وہ بھی دل کھول کراس دعوت کوقبول کرکے کام کے مقدمات کوفراہم کرتے ہوئے ان کی مٹھائی کوتناول کرتے ہیں۔یہی مٹھائی اورخاص قند ہے جوحشرات کی غذا شمار ہوتی ہے اور جب یہ بہت ڈھیر ہوجاتی ہےتو یہی شہد بن جاتا ہے۔کیونکہ جب حشرات پھولوں

کے پاس آتے ہیں، تو اس مٹھائی سے تھوڑا سا کھاتے ہیں اور اس کا زیادہ تر حصہ بے تکلّف مہمانوں کی طرح اپنے ساتھ لے جا کر اپنے چھتوں میں ذخیرہ کرتے ہیں۔ پھولوں اور حشرات کے درمیان دوستی ومحبت کا یہ معاہدہ دوطرفہ منافع کی بنیاد پر ہمیشہ تھا اور رہے گا۔

توحید کا ایک درس

جب انسان حشرات اور پھولوں کی زندگی میں ان حیرت انگیز نکات کا مطالعہ کرتا ہے، تو غیر شعوری طور پر اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے: پھولوں اور حشرات کے درمیان اس دوستی ومحبت کے عہد و پیمان کو کس نے برقرار کیا ہے؟

پھولوں کو یہ مخصوص مٹھاس اور لذیز غذا کس نے دی ہے؟ یہ دلکش اور خوشنما رنگ اور یہ خوشبو پھولوں کو کس نے عطا کی ہے کہ اس طرح حشرات کو اپنی طرف دعوت کرتے ہیں؟

حشرات، تتلیوں، شہد کی مکھیوں اور بھڑوں کو یہ نازک پاؤں اور خوبصورت اندام کس نے عطا کئے ہیں تا کہ پھولوں کی خلیہ کو نقل وانتقال دینے کے لئے مستعد وآمادہ رہیں؟

شہد کی مکھیاں کیوں ایک مدت تک خاص ایک ہی قسم کے پھولوں کی طرف رخ کرتی ہیں اور پھولوں اور حشرات کی خلقت کی تاریخ کیوں ایک ساتھ شروع ہوئی ہے؟

کیا کوئی شخص، جس قدر بھی ہٹ دھرم ہو، باور کرسکتا ہے کہ یہ سب واقعات پہلے سے مرتب ہوئے کسی نقشہ اور منصوبہ کے بغیر انجام پائے ہیں؟ اور فطرت کے بے شعور قوانین ان حیرت انگیز مناظر کو خود بخود وجود میں لائے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿٦٨﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ؕ

(سورۂ نحل/ ٦٨، ٦٩)

"اور تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کو اشارہ دیا کہ پہاڑوں اور درختوں اور گھروں کی بلندیوں میں اپنے گھر بنائے اس کے بعد مختلف پھلوں سے غذا حاصل کرے اور نرمی کے

ساتھ خدائی راستہ پر چلے۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ پھولوں کی تہ میں پائی جانے والی مٹھاس اوران کے رنگ وخوشبو کے کیافائدے ہیں؟

۲۔ شہد کی مکھیوں کی زندگی کے عجائبات میں سے آپ کیا جانتے ہیں؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دسواں سبق: نہایت چھوٹی مخلوقات کی دنیا

چونکہ ہم اس عالم خلقت کے عجائبات کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رہنے کے عادی ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہم ان حیرت انگیز مخلوقات کی اہمیت سے اکثر غافل رہ جاتے ہیں ،مثال کےطور پر:

ا۔ ہمارے اردگرد بہت چھوٹے چھوٹے حیوانات اورحشرات پائے جاتے ہیں۔ کہ شاید ان میں سے بعض کا جسم ایک یا دو ملی میٹر سے زیادہ نہیں ہوگا، پھر بھی یہ حیوانات ایک بڑے حیوان کے مانند ہاتھ پاؤں، آنکھیں اورکان، یہاں تک کہ دماغ وہوش، پٹھوں کا سلسلہ اورنظام ہاضمہ رکھتے ہیں۔

اگر ہم ایک چیونٹی کے دماغ کو مائیکروسکوپ کے نیچے رکھ کراس کی حیرت ناک بناوٹ پرنظرڈالتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کیا عجیب اوردلچسپ بناوٹ ہے! اس کے مختلف حصے، جن میں سے ہرایک حصہ اس چیونٹی کے چھوٹے سے اندام کے ایک حصہ کا کنٹرول سنبھالے ہوئے ہے، ایک دوسرے کے ساتھ منظم صورت میں قرار پائے ہیں اوران کی حالت میں معمولی سا خلل ان کے بدن کے ایک ہی حصہ کو مفلوج کرتا ہے۔

تعجب اورحیرت کی بات ہے کہ اس چھوٹے سے دماغ میں، جو یقیناً ایک پن کی نوک سے بھی بہت چھوٹا ہے، ہوش، ذہانت، تمدن، ذوق اور ہنر کی ایک دنیا پوشیدہ ہے۔ بہت سے سائنسدانوں نے سالہا سال تک اس حیوان کی زندگی کے حالات پر تحقیق ومطالعہ کرنے میں اپنی عمر صرف کی ہے اوراس کے بارے میں دلچسپ اورحیرت انگیز نکات اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔

کیا جس نے اس قسم کے ایک چھوٹے سے حشرہ میں اس قدر ہوش، فطانت اور ذوق کو جمع کردیا ہے، وہ ایسی طبیعت ہوسکتی ہے جس میں ایک سوئی کی نوک کے برابر ہوش وذہانت نہ ہو؟

۲۔ ایٹم کی پراسرار دنیا کے بارے میں، ہم جانتے ہیں کہ سب سے چھوٹی مخلوق جس کے بارے میں بشر کو اب تک معلومات حاصل ہوئی ہیں ایٹم اوراس کے اجزاء ہیں۔ ایٹم اتنا چھوٹا ہے کہ طاقتورترین مائیکروسکوپ، جو ایک تنکے کو پہاڑوں کی شکل میں دکھاتا ہے، وہ بھی اسے دیکھنے میں عاجز ہے۔

اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ ایٹم کتنا چھوٹا ہے، تو بس اس قدر جانئے کہ پانی کے ایک قطرہ میں روئے زمین کی پوری آبادی سے زیادہ ایٹم موجود ہیں۔ اگر ہم ایک سینٹی میٹر باریک ترین تار کے پروٹونوں کو

گننا چاہیں اور ایک ہزار افراد سے مدد بھی لیں اور ہر سیکنڈ میں ہر شخص ایک پروٹون کو جدا کرے تو ۳۰ سے ۳۰۰ سال تک ایٹموں کے اختلاف کے مطابق ہمیں دن رات بیدار رہنا پڑے گا تا کہ ان کو گن سکیں۔

اب جبکہ ہمیں معلوم ہوا کہ ایک سینٹی میٹر باریک تار میں اس قدر ایٹم موجود ہیں، تو ذرا سوچئے آسمان، زمین، آب وہوا، کہکشانوں اور ہمارے منظومہ شمسی میں کتنے ایٹم ہوں گے؟ کیا انسان کا ذہن اس کے تصور سے خستہ نہیں ہوجائے گا اور خالق کائنات کے علاوہ کوئی اس کا حساب لگا سکتا ہے؟

ایٹم، توحید کا درس دیتے ہیں

آج کل کی سائنسی بحث میں ایٹم شناسی اہم ترین بحث ہے۔ یہ انتہائی چھوٹی مخلوق ہمیں توحید کا درس دیتی ہے، کیونکہ ایٹم کی دنیا میں دوسری چیزوں سے زیادہ اس کے مندرجہ ذیل چار نکتے توجہ کو اپنی طرف مبذول کرتے ہیں:

۱۔غیر معمولی نظم وضبط۔ اب تک ایک سو سے زیادہ عناصر منکشف ہوئے ہیں۔ ان کے الیکٹرون تدریجاً ایک سے شروع ہوکر ایک سو سے زیادہ پر ختم ہوتے ہیں۔ یہ عجیب نظام ہرگز کسی بے شعور عامل کا پیداوار نہیں ہوسکتا ہے۔

۲۔قوتوں کا توازن۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک دوسرے کی مخالف برقی رویں ایک دوسرے کو جذب کرتی ہیں۔ اس لحاظ سے ایک ایٹم کے اندر موجود الیکٹرون جو منفی برقی رو رکھتے ہیں، ان کا مرکز (nucleus)، جو مثبت برقی رو کا حامل ہے، ان کو ایک دوسرے کو جذب کرنا چاہئے۔

اور دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ نیوکلیس کے گرد الیکٹرونوں کی گردش سے قوۂ دافعہ (مرکز سے دور ہونے کی طاقت) وجود میں آتی ہے۔ اس لئے یہ قوۂ دافعہ الیکٹرونوں کو ایٹم کے دائرہ سے دور کرنا چاہتی ہے تا کہ ایٹم کا تجزیہ ہوجائے اور ادھر سے قوۂ جاذبہ الیکٹرونوں کو جذب کر کے ایٹم کو نابود کرنا چاہتی ہے۔

یہاں پر قابل توجہ بات ہے کہ ایٹموں کے اندر کس دقیق حساب سے قوۂ جاذبہ ودافعہ منظم ہوئی ہیں کہ الیکٹرون نہ بھاگتے ہیں اور نہ جذب ہوتے ہیں، بلکہ ہمیشہ ایک توازن کی حالت میں اپنی حرکت کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس توازن کو ایک اندھی اور بہری طبیعت نے وجود میں لایا ہو؟

۳۔ ہر ایک اپنے معین راستہ پر گامزن ہے۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا کہ بعض ایٹموں کے متعدد الیکٹرون ہوتے ہیں لیکن یہ سب الیکٹرون ایک

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

مدار پر حرکت نہیں کرتے، بلکہ یہ متعدّد مداروں پر حرکت کرتے ہیں۔

یہ الیکٹروں لاکھوں سالوں سے ایک معین فاصلہ پر اپنے حدود میں بڑی تیزی کے ساتھ حرکت میں ہیں اوران میں آپس میں کسی قسم کا ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا ہے۔

کیاان میں سے ہرایک کوان کے معین مداروں میں قرار دینااورایک حیرت انگیز نظام کے ساتھ ان کوحرکت میں لاناایک آسان کام ہے؟

۴۔ایٹم کی عظیم طاقت۔

ایٹم کی طاقت کی عظمت کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اس بات پر غور کرنا کافی ہے:

۱۹۴۵ء میں میلکسیکو کے ایک بے آب وعلف صحرا میں ایک ایٹمی تجربہ انجام دیا گیا۔ایک چھوٹے سے ایٹم بمب کوایک فولادی ٹاور پر چھوڑ دیا گیا۔اس نے پھٹنے کے بعداس فولادی ٹاور کو پانی میں تبدیل کر دیا پھراسے بھاپ میں تبدیل کر دیااورایک مہیب بجلی اورآواز بلند ہوئی۔جب سائنسدان اس جگہ پر پہنچے تو ٹاور کا کوئی نام ونشان نہیں پایا۔

اسی سال جاپان پردوچھوٹے ایٹم بم پھینکے گئے۔ایک کوشہرناکاساکی پراوردوسرے کوشہر ہیروشیما پر۔پہلے شہر میں ۷۰ ہزارلوگ ہلاک ہو گئے اوراتنے ہی لوگ مجروح ہوئے اوردوسرے شہر میں ۳۰ سے ۴۰ ہزارلوگ ہلاک ہو گئے اوراتنے ہی لوگ مجروح بھی ہوئے،جس کے نتیجے میں جاپان نے مجبور ہو کر امریکہ کے سامنے بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دئے۔

کیاایٹم کے صرف ایک ذرّہ کے اسرار کا مطالعہ کرناانسان کوخالق کائنات کی معرفت حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟

لہذاوثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے پاس کائنات میں موجودایٹموں کی تعداد کے برابر خداکے وجود کے دلائل موجود ہیں۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ط (سورۂ لقمان/۲۷)

"اور اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور سمندر کا سہارا دینے کے لئے سات سمندر اور آجائیں تو بھی کلمات الٰہی تمام ہونے والے نہیں ہیں۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کیا آپ چیونٹیوں کی زندگی کے اسرار کے بارے میں کچھ اور معلومات رکھتے ہیں؟

۲۔کیا آپ ایک ایٹم کی بناوٹ کا خاکہ تختہ سیاہ پر کھینچ سکتے ہیں؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دسویں سبق کی ایک تکمیلی بحث

خداوند متعال کی عظیم الشان صفات

صفات خدا

قابل غور بات ہے کہ جس قدر خلقت کائنات کے اسرار کا مطالعہ کرنے کے طریقہ سے خدا کو پانا یعنی وجود خدا کے بارے میں علم حاصل کرنا آسان ہے، اسی قدر خداوند متعال کی صفات کو بھی دقّت اور کافی احتیاط کے ساتھ پہچاننے کی ضرورت ہے۔

آپ ضرور پوچھیں گے کیوں؟ اس کی دلیل واضح ہے، کیونکہ خداوند متعال ہماری کسی چیز سے یا جو کچھ ہم نے دیکھا ہے یا سنا ہے ان سب سے شباہت نہیں رکھتا ہے۔ اسی لئے خدا کی صفت کو پہچاننے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ ہم اس مقدس ذات سے مخلوقات کی تمام صفات کی نفی کریں۔ یعنی خداوند عالم کو اس محدود عالم طبیعت کی مخلوقات میں سے کسی ایک سے بھی تشبیہ نہ دیں یہ ایک بہت ہی نازک مرحلہ ہے، کیونکہ ہم اس طبیعت کے اندر نشوونما پائے ہیں، ہم طبیعت سے متصل ومرتبط رہے ہیں، اس سے اُنس پیدا کر چکے ہیں، اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہر ایک چیز کو اس کے پیمانہ پر تولیں۔

دوسرے الفاظ میں ہم نے جو دیکھا ہے وہ جسم اور جسم کی خاصیت رکھنے والی چیزیں تھیں، یعنی ایسی موجودات جو ایک معین زمان ومکان کی حامل تھیں، ان کے مخصوص ابعاد اور اشکال تھیں۔ اس حالت میں ایک ایسے خدا کا تصور کہ نہ جسم رکھتا ہے اور نہ زمان ومکان، اس کے باوجود تمام زمان ومکان پر وہ احاطہ رکھتا ہے اور ہر لحاظ سے لامحدود ہے، ایک مشکل کام ہے۔ یعنی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس راستہ پر دقت کے ساتھ قدم رکھیں۔

لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا انتہائی ضروری ہے کہ ہم خداوند متعال کی ذات کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکتے اور اس کی ہمیں توقع بھی نہیں رکھنی چاہئے، کیونکہ اس قسم کی توقع اس بات کے مانند ہے کہ ہم یہ توقع رکھیں کہ ایک عظیم سمندر کو ایک چھوٹے سے کوزے میں سمو دیں یا ماں کے بطن میں موجود بچے کو باہر کی تمام دنیا سے مطلع کردیں، کیا ایسا ممکن ہے؟

اس نازک مرحلہ پر ممکن ہے ایک چھوٹی سی لغزش انسان کو معرفت خدا کے راستہ سے کوسوں دور لے جا کر پھینک دے اور بت پرستی ومخلوق پرستی کی سنگلاخ وادیوں میں آوارہ کردے۔(توجہ کیجئے!)
مختصر یہ کہ ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ صفات خدا کا مخلوقات کی صفات سے کبھی موازنہ نہ کریں۔

صفات جمال وجلال

عام طور پر خداوندمتعال کی صفات کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے: صفات ثبوتیہ یعنی وہ صفات جو خداوندمتعال میں پائی جاتی ہیں اور صفات سلبیہ یعنی وہ صفات جن سے خداوندمتعال منزّہ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خداوندمتعال کی ذات کتنی صفتوں کی مالک ہے؟ اس کا جواب یہ ہے: خداوندمتعال کی صفات ایک لحاظ سے لامحدود ہیں اور دوسرے لحاظ سے خداوندمتعال کی تمام صفات ایک صفت میں خلاصہ ہوتی ہیں کیونکہ خداوندمتعال کی تمام ثبوتی صفات کو مندرجہ ذیل ایک جملہ میں خلاصہ کیا جاسکتا ہے:

خداوندمتعال کی ذات، ہر جہت سے لامحدود اور تمام کمالات کی مالک ہے۔

اس کے مقابلہ میں سلبی صفات بھی اس جملہ میں خلاصہ ہوتی ہیں: ذات باری تعالیٰ میں کسی لحاظ سے کوئی نقص نہیں ہے۔

لیکن چونکہ دوسرے لحاظ سے کمالات اور نقائص کے درجات ہیں، یعنی لامحدود کمال اور لامحدود نقص کا تصور کیا جاسکتا ہے، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خداوندمتعال لامحدود صفات ثبوتیہ اور لامحدود صفات سلبیہ رکھتا ہے۔ کیونکہ جس کمال کا بھی تصور کیا جائے وہ خدا میں موجود ہے اور جس نقص کا بھی تصور کیا جائے خداوندمتعال اس سے پاک ومنزّہ ہے۔ لہذا خداوندمتعال کی ثبوتی وسلبی صفات لامحدود ہیں۔

خدا کی مشہورترین صفات ثبوتیہ

خداوندمتعال کی معروف ترین صفات ثبوتیہ وہی ہیں، جن کو مندرجہ ذیل مشہور شعر میں ذکر کیا گیا ہے:

عالم وقادر وحیّ است ومرید ومدرک
ہم قدیم ازلی پس متکلم صادق

۱۔خداوندمتعال عالم ہے،یعنی ہر چیز جانتا ہے۔

۲۔قادر ہے،یعنی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

۳۔حیّ ہے،یعنی زندہ ہے، کیونکہ زندہ موجود وہ ہے جو علم وقدرت رکھتا ہو چونکہ خداوندمتعال عالم وقادر ہے،اس لئے زندہ ہے۔

۴۔مرید ہے،یعنی صاحب ارادہ ہے اوراپنے کاموں میں مجبور نہیں ہے جو کام بھی انجام دیتا ہے اس کا کوئی مقصد اور فلسفہ ہوتا ہے اور زمین وآسمان میں کوئی بھی چیز فلسفہ اور مقصد کے بغیر نہیں ہے۔

۵۔خداوندمتعال مدرک ہے،یعنی تمام چیزوں کو درک کرتا ہے،تمام چیزوں کو دیکھتا ہے،تمام آوازوں کوسنتا ہے اور تمام چیزوں سے آگاہ وباخبر ہے

۶۔خداوندمتعال قدیم اورازلی ہے،یعنی ہمیشہ تھا اوراس کے وجود کا کوئی آغاز نہیں ہے، کیونکہ اس کی ہستی اسی کی ذات کے اندر سے ابلتی ہے،اسی وجہ سے ابدی اور جاودانی بھی ہے۔اس لئے کہ جس کی ہستی اس کی ذاتی ہواس کے لئے فنااورنابودی کوئی معنی رکھتی۔

۷۔خداومدمتعال متکلم ہے،آواز کی لہروں کو ہوا میں ایجاد کرسکتا ہے تا کہ اپنے انبیاء ومرسلین سے بات کرے،نہ یہ کہ خداوندمتعال زبان،ہونٹ اور گلا رکھتا ہے۔

۸۔خداوندمتعال صادق ہے،یعنی جو کچھ کہتا ہے سچ اور عین حقیقت ہے، کیونکہ جھوٹ بولنا یا جہل ونادانی کی وجہ سے ہوتا ہے یا ضعیف وناتوانی کی وجہ سے، چونکہ خداوندمتعال عالم اور قادر ہے اس لئے محال ہے کہ وہ جھوٹ بولے۔

خدا کی مشہورترین صفات سلبیہ۔

خداوندمتعال کی معروف ترین سلبی صفات مندرجہ یل شعر میں ملاحظہ فرمائیں:

ترجمہ:

۱۔وہ مرکب نہیں ہے۔یعنی اس کے اجزائے ترکیبی نہیں ہیں ، کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے اجزاء کی احتیاج پیدا کرتا،جبکہ وہ کسی چیز کا محتاج نہیں ہے۔

۲۔خداوندمتعال جسم نہیں ہے، کیونکہ ہرجسم محدود،متغیراورنابودی کے قابل ہوتا ہے۔

۳۔خداوندمتعال مرئی نہیں ہے یعنی دکھائی نہیں دیتا، کیونکہ اگر وہ دکھائی دیتا تو جسم ہوتا اور محدود

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اور قابل فنا ہوتا۔

۴۔ خداوند متعال کوئی محل نہیں رکھتا ہے، کیونکہ وہ جسم نہیں ہے تا کہ اسے محل کی ضرورت پڑے۔

۵۔ خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، کیونکہ اگر اس کا شریک ہوتا تو اسے ایک محدود موجود ہونا چاہئے تھا، چونکہ دو لامحدود موجودات ہر جہت سے ناممکن ہیں، اس کے علاوہ اس دنیا کے قوانین کی وحدت اس کی وحدانیت کی علامت ہے۔

۶۔ خداوند متعال کے معانی نہیں ہیں، کیونکہ اس کی صفات اس کی عین ذات ہیں۔

۷۔ خداوند متعال محتاج اور نیاز مند نہیں ہے، بلکہ غنی اور بے نیاز ہے، کیونکہ علم وقدرت اور ہر چیز کے لحاظ سے ایک لامحدود وجود، کسی قسم کی کوئی کمی نہیں رکھتا ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (سورہ شوری آیت/۱۱)

"اس کے مانند کوئی چیز نہیں ہے۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ کیا خدا کی وحدانیت اور اس کے لاشریک ہونے کے بارے میں آپ کے پاس کوئی اور دلیل موجود ہے؟

۲۔ کیا آپ نے سنا ہے کہ بعض مذاہب تین خداؤں اور بعض دو خداؤں کے قائل ہیں؟ یہ کون سے مذاہب ہیں؟

عدل الٰہی کے دس سبق

پہلا سبق عدل کیا ہے؟

خدا کی صفات میں سے صرف عدل کو اصول دین کا جزو کیوں قرار دیا گیا ہے؟

"عدالت" اور "مساوات" کے درمیان فرق

۱۔تمام صفات الٰہی سے کیوں صرف عدل کو چنا گیا ہے؟

اس بحث میں دوسری چیزوں سے پہلے یہ نکتہ واضح ہونا چاہئے کہ عدالت کو جو کہ صفات خدا میں سے ایک صفت ہے، بڑے علماء نے دین اصول کے پنجگانہ میں سے ایک اصل کے طور پر کیوں منتخب کیا ہے؟

خداوند متعال عالم ہے، قادر ہے، عادل ہے، حکیم ہے، رحمان ورحیم اور ازلی وابدی ہے، خالق ورازق ہے۔ان تمام صفات میں سے کیوں صرف عدالت کا انتخاب کیا گیا ہے اور اسی کو دین کے پنجگانہ اصول میں سے ایک قرار دیا گیا ہے؟

اس سوال کے جواب کے سلسلہ میں چند مطالب کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے:

۱۔خداوند متعال کی صفات میں عدالت کو ایک ایسی اہمیت حاصل ہے کہ بہت سی دوسری صفات اس کی طرف پلٹتی ہیں، کیونکہ "عدالت" اپنے وسیع معنی میں ہر ایک چیز کو اپنی جگہ پر قرار دینا ہے۔اس صورت میں حکیم، رزّاق، رحمان ورحیم اوران جیسی دوسری صفات اس پر منطبق ہوتی ہیں۔

۲۔معاد کا مسئلہ بھی "عدل الٰہی" پر منحصر ہے۔انبیاء ومرسلین کی نبوت ورسالت اور ائمہ کی امامت بھی عدل الٰہی سے مربوط ہیں۔

۳۔اسلام کی ابتداء میں عدل الٰہی کے مسئلہ پر کچھ اختلافات رونما ہوئے:

سنّی مسمانوں کا ایک گروہ جنھیں "اشاعرہ" کہتے تھے، عدل الٰہی کے بالکل منکر ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ خدا کے بارے میں عدل وظلم کوئی مفہوم نہیں رکھتا ہے۔پوری کائنات اس کی ملک ہے اور اس سے متعلق ہے، وہ جو بھی کام انجام دے وہی عین عدالت ہے۔یہاں تک کہ وہ حسن وقبح عقلی کے بھی قائل نہیں

تھے۔وہ کہتے تھے کہ ہماری عقل اکیلے ہی برے اور بھلے کو درک نہیں کرسکتی ہے، یہاں تک کہ نیکی کرنے کی خوبی اور ظلم کی بدی کو بھی درک نہیں کرسکتی ہے (وہ اس قسم کے بہت سے مغالطے سے دوچار تھے)

اہل سنت کا ایک دوسرا گروہ جنھیں "معتزلہ" کہتے تھے اور تمام "شیعہ" پروردگار عالم کے بارے میں عدالت کے اصول کے قائل تھے اور کہتے تھے وہ ہرگز ظلم وستم نہیں کرتا ہے۔

ان دو گروہوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے لئے دوسرے گروہ کا نام "عدلیہ" رکھا گیا، جو عدل الٰہی کو اپنے مکتب کی علامت کے عنوان سے اصول دین کا جزو سمجھتے تھے اور پہلے گروہ کا نام "غیر عدلیہ" رکھا گیا،شیعہ "عدلیہ" گروہ میں شمار ہوتے تھے۔

شیعوں نے دوسرے تمام عدلیہ سے اپنے آپ کو مشخص کرنے کے لئے "امامت" کو بھی اصول دین کا جزو قرار دیا۔

لہذا جہاں کہیں بھی "عدل" و"امامت" کی بات ہو وہ "شیعہ امامیہ" کی پہچان ہے۔

۴۔چونکہ فروع دین ہمیشہ اصول دین کا ایک پرتو ہے اور عدالت الٰہی کا اثر انسانی معاشروں میں غیر معمولی طور پر مؤثر ہے اور انسانی معاشرے کی اہم ترین بنیاد بھی اجتماعی عدالت پر منحصر ہے،اس لئے عدالت کو اصول دین کے ایک جزو کے طور پر چن لینا ایک ایسا راز ہے جو انسانی معاشرے میں عدل کو زندہ کرنے اور ہر قسم کے ظلم وستم سے مقابلہ کرنے کا سبب بنتا ہے۔

جس طرح پروردگار کی توحید ذات وصفات اور اس کی عبادت و پرستش کی توحید انسانی معاشرے میں وحدت ویکجہتی اور اتحاد کا نور ہے اور توحید صفوف کو تقویت بخشتی ہے،اسی طرح انبیاء اور ائمہ کی رہبری بھی انسانی معاشرے میں "سچی (عادلانہ) رہبری" کا مسئلہ القا کرتی ہے۔اس لئے پوری کائنات پر حاکم پروردگار کی عدالت کی اصل انسانی

معاشرے کے تمام مواقع میں عدالت کی ضرورت کی طرف ایک اشارہ وراز ہے۔

عظیم عالم خلقت عدالت پر برقرار ہے۔انسانی معاشرہ بھی اس کے بغیر برقرار نہیں رہ سکتا ہے۔

۲۔عدالت کیا ہے؟

عدالت کے دو مختلف معانی ہیں:

۱۔اس لفظ کے وسیع معنی ،جیسا کہ ہم نے بیان کئے "ہر چیز کا اپنی جگہ پر قرار پانا" ہیں۔دوسرے

الفاظ میں موزون اور متعادل ہونا ہے۔

عدالت کے یہ معنی، پوری خلقت کائنات، عالم کے نظام، ایٹم، انسانی وجود کی بناوٹ اور تمام نباتات وحیوانات میں پائے جاتے ہیں۔

یہ وہی بات ہے جو پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے کہ آپ نے فرمایا:

"بالعدل قامت السموٰت والارض"

"عدالت کے ذریعہ آسمان اور زمین برقرار ہیں"

مثال کے طور پر اگر زمین کے قوائے "جاذبہ" و "دافعہ" اپنے توازن کو کھودیں اور ان میں سے ایک دوسرے پر غلبہ پا جائے تو زمین، یا سورج کی طرف جذب ہو جائے گی، اس میں آگ لگ جائے گی اور نابود ہو جائے گی اور یا اپنے مدار سے خارج ہو کر وسیع فضا میں آوارہ ہو کر نابود ہو جائے گی۔

عدالت کے اسی معنی کو شاعر نے مندرجہ ذیل مشہور اشعار میں بیان کیا ہے:

عدل چیود؟ وضع اندر موضعش ظلم چیود؟ وضع در نا موضعش

عدل چیود؟ آب دہ اشجار را ظلم چیود؟ آب دادن خار را

عدل کیا ہے؟ ہر چیز کو اس کی جگہ پر رکھنا۔ ظلم کیا ہے؟ چیز کو اس جگہ پر نہ رکھنا۔

عدل کیا ہے؟ درختوں کو پانی دینا ظلم کیا ہے؟ کانٹوں کو پانی دینا۔

واضح ہے کہ پھولوں کے پودے یا میوہ دار درخت کی آبیاری کی جائے تو یہ اس کا صحیح استعمال ہے اور عین عدالت ہے۔ اگر بیکار گھاس پھوس یا کانٹوں کی آبیاری کی جائے تو یہ اس کا صحیح استعمال نہیں ہے اور عین ظلم ہے۔

۲۔ عدالت کے دوسرے معنی "افراد کے حقوق کی رعایت کرنا" ہیں اور اس کا مخالف "ظلم" یعنی دوسروں کا حق چھین کر اپنے لئے مخصوص کرنا، یا کسی کا حق چھین کر دوسرے کو دینا یا تفریق کا قائل ہونا ہے، اس صورت میں کہ بعض کو ان کا حق ادا کریں اور بعض کو ان کا حق ادا نہ کریں۔

واضح ہے کہ دوسرے معنی "خاص" اور پہلے معنی "عام" ہیں قابل توجہ بات ہے کہ "عدل" کے دونوں معانی خداوند متعال کے بارے میں صحیح ہیں اگر چہ ان مباحث میں زیادہ تر دوسرے معنی مقصود ہیں۔

عدل الٰہی کے معنی یہ ہیں کہ خداوند متعال نہ کسی کا حق چھینتا ہے اور نہ کسی کا حق کسی دوسرے کو دیتا

ہے اور نہ افراد کے درمیان امتیاز برتتا ہے، وہ ہر لحاظ سے عادل ہے۔ اس کی عدالت کے دلائل سے اگلی بحث میں آگاہ ہوں گے۔

"ظلم" کسی کا حق چھیننے کے معنی میں ہو یا کسی کا حق کسی دوسرے کو دینے کے معنی میں یا تفریق وزیادتی کی صورت میں، خدا کی ذات کے بارے میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

وہ ہرگز نیک انسان کو سزا نہیں دیتا ہے اور بُرے انسان کی تشویق نہیں کرتا ہے۔ کسی سے دوسرے کے گناہ پر مواخذہ نہیں کرتا ہے اور بُرے اور بھلے سے ایک ہی قسم کا برتاؤ نہیں کرتا ہے۔

یہاں تک کہ اگر ایک بڑے معاشرے میں ایک شخص کے علاوہ سب گناہ گار ہوں تو خداوند متعال اس ایک شخص کے حساب کو دوسروں سے جدا کرتا ہے اور اسے
گناہ گاروں کے ساتھ سزا میں شامل نہیں کرتا ہے۔

یہ جو "اشاعرہ" کی جماعت نے کہا ہے کہ "اگر خدا تمام انبیاء کو جہنّم میں ڈال دے اور تمام بدکاروں اور ظالموں کو بہشت میں ڈال دے، تو یہ ظلم نہیں ہے" یہ ایک بیہودہ، ناشائستہ، شرم ناک اور بے بنیاد بات ہے، جس شخص کی بھی عقل خرافات اور تعصب سے آلودہ نہ ہوگی وہ اس بات کے قبح کی گواہی دے گا۔

۳۔ مساوات اور عدالت میں فرق۔

ایک اور اہم نکتہ، جس کی طرف اس بحث میں اشارہ کرنا ضروری ہے، یہ ہے کہ بعض اوقات "عدالت" کا "مساوات" سے مغالطہ کیا جاتا ہے اور تصور کیا جاتا ہے کہ عدالت کے معنی یہ ہیں کہ مساوات کی رعایت کی جائے، جبکہ ایسا نہیں ہے۔

عدالت میں ہرگز مساوات شرط نہیں ہے بلکہ حق اور ترجیحات کو مدنظر رکھا جانا چاہیئے۔

مثال کے طور پر ایک جماعت کے شاگردوں میں عدالت یہ نہیں ہے کہ سب کو مساوی نمبر دئے جائیں اور دو مزدوروں کے درمیان یہ عدالت نہیں ہے کہ دونوں کو مساوی مزدوری دی جائے۔ بلکہ عدالت یہ ہے کہ ہر شاگرد کو اس کی لیاقت اور صلاحیت کے مطابق نمبر دئے جائیں اور ہر مزدور کو اس کی محنت کے مطابق مزدوری دی جائے۔

عالم فطرت میں بھی وسیع معنی میں عدالت کا مفہوم یہی ہے۔ اگر ایک وہیل مچھلی کا دل جس کا وزن تقریباً ایک ٹن ہوتا ہے، ایک چڑیا کے دل کے برابر ہوتا تو یہ عدالت نہیں تھی۔ اگر ایک مضبوط لمبے درخت کی

جڑ ایک چھوٹے سے پودے کی جڑ کے برابر ہوتو یہ عدالت نہیں ہے بلکہ عین ظلم ہے۔

عدالت کے معنی یہ ہیں کہ ہر مخلوق اپنے حق، استعداد اور صلاحیت کے مطابق اپنا حصہ حاصل کرے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ خدا کی تمام صفات میں سے صرف عدالت کو کیوں اصول دین کا جزو شمار کیا گیا ہے؟

۲۔"اشاعرہ" کون تھے؟ ان کے عقائد کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۳۔ عدل الٰہی کا اعتقاد معاشرے میں کیا اثر رکھتا ہے؟

۴۔ عدالت کے کتنے معانی ہیں؟ ان کی تشریح کیجئے

۵۔ کیا عدالت مساوات کے معنی میں ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دوسرا سبق: عدل الٰہی کے دلائل

ا۔ حسن وقبح عقلی

پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ہماری عقل اشیاء کی "خوبی" اور "بدی" کو قابل توجہ حد تک درک کرتی ہے۔(یہ وہی چیز ہے، جس کا نام علماء نے "حسن قبح عقلی" رکھا ہے)

مثلا ہم جانتے ہیں کہ عدالت واحسان اچھی چیز ہے اور ظلم وبخل بری چیز ہے۔ یہاں تک کہ ان کے بارے میں دین و مذہب کی طرف سے کچھ کہنے سے پہلے بھی ہمارے لئے یہ چیز واضح تھی، اگر چہ دوسرے ایسے مسائل موجود ہیں جن کے بارے میں ہمارا علم کافی نہیں ہے اور ہمیں رہبران الٰہی وانبیاء کی رہبری سے استفادہ کرنا چاہئے۔

اس لئے اگر "اشاعرہ" کے نام سے مسلمانوں کے ایک گروہ نے "حسن قبح عقلی" سے انکار کر کے اچھائی اور برائی کو پہچاننے کا راستہ۔حتی عدالت وظلم وغیرہ کے سلسلہ میں۔صرف شرع ومذہب کو کافی جانا ہے ،تو یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے۔

کیونکہ اگر ہماری عقل نیک وبد کو درک کرنے کی قدرت وصلاحیت نہ رکھتی ہوتو ہمیں کہاں سے معلوم ہوگا کہ خداوند متعال معجزہ کو ایک جھوٹے انسان کے اختیار میں نہیں دیتا ہے؟ لیکن جب ہم کہتے ہیں کہ جھوٹ بولنا بُرا اور قبیح ہے اور خدا سے یہ کام انجام پانا محال ہے،تو ہم جانتے ہیں کہ خدا کے وعدے سب حق ہیں اور اس کے بیانات سب سچے ہیں۔ وہ کبھی جھوٹے کی تقویت نہیں کرتا ہے اور معجزہ کو ہر گز جھوٹے کے اختیار میں نہیں سونپتا ہے۔

اسی وجہ سے شرع ومذہب میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

اس لئے ہم نتیجہ حاصل کرتے ہیں کہ حسن وقبح عقلی پر اعتقاد دین ومذہب کی بنیاد ہے۔(توجہ کیجئے!)

اب ہم عدل الٰہی کے دلائل کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے ہمیں جاننا چاہئے:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۲۔ظلم کا سرچشمہ کیا ہے؟

"ظلم" کا سرچشمہ مندرجہ ذیل امور میں سے ایک ہے:

الف۔جہل:بعض اوقات ظالم انسان حقیقت میں نہیں جانتا ہے کہ وہ کیا کرتا ہے۔نہیں جانتا ہے کہ وہ کس کی حق تلفی کرتا ہے،اوراپنے کام سے بے خبر ہے۔

ب۔احتیاج:کبھی دوسروں کے پاس موجود چیز کی احتیاج انسان کو وسواس میں ڈالتی ہے کہ اس شیطانی کام کوانجام دے،جبکہ اگر بے نیاز ہوتا،اس قسم کے مواقع پر اس کے لئے ظلم کرنے کی کوئی دلیل موجود نہ ہوتی۔

ج۔عجز وناتوانی:بعض اوقات انسان راضی نہیں ہوتا کہ دوسروں کا حق ادا کرنے میں کوتاہی کرے لیکن اس میں یہ کام انجام دینے کی قدرت وتوانائی نہیں ہوتی ہے اور ناخواستہ"ظلم" کا مرتکب ہوتا ہے۔

د۔خود پرستی ، حسد اور انتقامی جذبہ۔ گاہے مذکورہ عوامل میں سے کوئی ایک مؤثر نہیں ہوتا ہے،لیکن"خود پرستی"اس امر کا سبب بنتی ہے کہ انسان دوسروں کے حقوق کو پائمال کرے۔یا"انتقامی جذبہ"اور"کینہ وحسد"اسے ظلم وستم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔یا کبھی"اجارہ داری" دوسروں کی حق تلفی کا سبب بن جاتی ہے۔اوران کے مانند دوسرے عوامل واسباب۔

لیکن چونکہ مذکورہ بری صفات اورعیوب ونقائص میں سے کوئی چیز خداوند متعال کے وجود مقدس میں نہیں پائی جاتی ،وہ ہر چیز کا عالم،سب سے بے نیاز،ہر چیز پر قادر اور ہر ایک کے بارے میں مہربان ہے،اس لئے اس کے لئے ظلم کا مرتکب ہونا معنی نہیں رکھتا ہے۔

اس کا وجود بے انتہا اور کمال لامحدود ہے،ایسے وجود سے خیر،نیکی،عدل وانصاف،مہربانی اور رحمت کے علاوہ کوئی چیز صادر نہیں ہوتی ہے۔

اگر وہ بدکاروں کو سزا دیتا ہے تو وہ حقیقت میں ان کے کرتوتوں کا نتیجہ ہوتا ہے، جو انھیں ملتا ہے،اس شخص کے مانند جو نشہ آور چیزیں یا شراب پینے کے نتیجہ میں مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔قرآن مجید فرماتا ہے:

هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۝ (سورہ نمل/۹۰)

"کیا تمھیں تمھارے اعمال کے علاوہ بھی کوئی معاوضہ دیا جاسکتا ہے۔"

۳۔قرآن مجید اور عدل الٰہی

قابل توجہ بات ہے کہ قرآن مجید میں اس مسئلہ کے بارے میں بہت تاکید کی گئی ہے۔

ایک جگہ پر فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ النَّاسَ شَیۡئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنۡفُسَہُمۡ یَظۡلِمُوۡنَ﴿۴۴﴾

(سورہ یونس/ ۴۴)

"اللہ انسانوں پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے ہیں۔"

ایک دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظۡلِمُ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ ۚ

"اللہ کسی پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے۔"

روز قیامت کے حساب اور جزا کے بارے میں فرماتا ہے:

وَنَضَعُ الۡمَوَازِیۡنَ الۡقِسۡطَ لِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ فَلَا تُظۡلَمُ نَفۡسٌ شَیۡئًا ؕ

(سورہ انبیاء/ ۴۷)

"اور ہم قیامت کے دن انصاف کی ترازو قائم کریں گے اور کسی نفس پر ادنیٰ ظلم نہیں کیا جائے گا۔"

(قابل توجہ بات ہے کہ یہاں پر "میزان" سے مقصود نیک و بد کو تولنے کا وسیلہ ہے نہ اس دنیا کے مانند کوئی ترازو)

۴۔عدل وانصاف کی دعوت

ہم نے کہا کہ انسان کی صفات، خداوند متعال کی صفات کا ایک پرتو ہونا چاہئیں تا کہ انسانی معاشرے میں الٰہی صفات کا نور پھیلے۔اسی اصول کی بنیاد پر جس قدر قرآن مجید عدل الٰہی کو بیان کرتا ہے، اسی قدر انسانی معاشرے اور ہر انسان میں عدل وانصاف قائم کرنے پر اہمیت دیتا ہے۔قرآن مجید بار بار ظلم کو معاشروں کی تباہی و بربادی کا سبب بتاتا ہے اور ظالموں کے انجام کو دردناک ترین انجام شمار کرتا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قرآن مجید گزشتہ اقوام کی داستان بیان کرنے کے ضمن میں بار بار اس حقیقت کی یاددہانی کرتا ہے کہ دیکھو ظلم وفساد کے نتیجہ میں کس طرح وہ اقوام عذاب الٰہی سے دو چار ہو کر نابود ہوئے ،تم بھی اس سے ڈرو کہ کہیں ظلم کرنے کے نتیجہ میں اس قسم کے انجام سے دو چار نہ ہو جاؤ۔

قرآن مجید واضح الفاظ میں ایک بنیادی اصول کے عنوان سے کہتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ (سورہ نحل/۹۰)

"بیشک اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے اور بدکاری ،ناشائستہ حرکات اور ظلم سے منع کرتا ہے۔"

قابل توجہ بات ہے کہ جس طرح ظلم کرنا ایک برا اور قبیح کام ہے، اسی طرح ظلم کو برداشت کرنا بھی اسلام اور قرآن کی نظر میں غلط ہے، چنانچہ سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۷۹ میں آیا ہے:

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴿۲۷۹﴾ (سورہ بقرہ/۲۷۹)

"نہ تم ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے"

اصولی طور پر ظلم کو قبول کرنا ظلم کی حوصلہ افزائی ،اس کی تقویت اور ظالم کی مدد کرنے کا باعث ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کیا ہماری عقل براہ راست اور شرع کے بغیر نیکی اور بدی کو درک کر سکتی ہے؟

۲۔ظلم کن امور سے صادر ہوتا ہے؟ عدل الٰہی کی عقلی دلیل کیا ہے؟

۳۔عدل الٰہی اور خدا کی ذات مقدس سے ظلم کی نفی کے بارے میں قرآن مجید کیا کہتا ہے؟

۴۔عدالت اور ظلم کے مقابلہ میں انسان کی کیا ذمہ داری ہے؟

۵۔کیا ظلم کو قبول کرنا اور ظلم وستم کو برداشت کرنا بھی گناہ ہے؟

تیسرا سبق: آفات وبلیّات کا فلسفہ(۱)

قدیم زمانہ سے آج تک ایک ناآگاہ گروہ نے عدل الٰہی پر نکتہ چینی کی ہے اور ایسے مسائل پیش کئے ہیں جو ان کے اعتقاد کے مطابق عدل الٰہی سے سازگار نہیں ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات نہ صرف ان مسائل کو عدل الٰہی کی نفی کی دلیل بلکہ انھیں وجود خدا کے انکار کی دلیل سمجھے ہیں!

من جملہ ان کے ناگوار حوادث کا وجود، جیسے طوفان، زلزلہ اور دوسرے عام مصائب۔

اسی طرح وہ فرق جو مختلف انسانوں میں پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ انسان، نباتات اور دوسری مخلوقات کو پیش آنے والی مصیبتیں اور آفتیں۔

یہ بحث، کبھی مادہ پرستوں کے مقابلہ میں معرفت خدا کی بحث میں پیش کی جاتی ہے اور کبھی عدل الٰہی کی بحث میں، ہم اسے اس بحث میں پیش کرتے ہیں۔

یہ جاننے کے لئے کہ، دقیق تجزیہ کے نتیجہ میں یہ تصور کس حد تک غلط ہے، اس موضوع پر ایک مفصل بحث اور مندرجہ ذیل مطالب کی دقیق کی تحقیق ضرورت ہے:

۱۔ محدود معلومات اور حالات کے زیر اثر فیصلے

عام طور پر ہم اپنے فیصلوں اور مصادیق کی تشخیص میں مختلف اشیاء کے اپنے ساتھ رابطہ پر تکیہ کرتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں فلاں چیز دور ہے یا نزدیک یعنی ہماری نسبت۔

یا فلاں شخص طاقتور ہے یا کمزور، یعنی ہماری روحی یا جسمی حالت کی نسبت اس کی حالت ایسی ہے ۔ خیر وشر اور مصیبت و بلا کے بارے میں بھی لوگوں کے فیصلے اکثر اسی طرح کے ہوتے ہیں۔

مثلاً اگر کسی علاقہ میں وسیع پیمانے پر بارش برسے، ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے کہ اس بارش کے مجموعی اثرات کیسے تھے، ہم صرف اپنی زندگی، گھر اور کھیت یا زیادہ سے زیادہ اپنے شہر کی حد تک نظر ڈالتے ہیں، اگر اس کا مثبت اثر تھا تو کہتے ہیں یہ نعمت الٰہی تھی، اگر منفی تھا تو اسے "بلا" کہتے ہیں۔

جب ایک پرانی اور فرسودہ عمارت کو نئے سرے سے تعمیر کرنے کے لئے گراتے ہیں اور ہم پر وہاں سے گزرتے ہوئے اس کے گرد وغبار پڑتے ہیں تو کہتے ہیں: کیسا برا حادثہ ہے، اگر چہ آئندہ وہاں پر ہسپتال ہی کیوں نہ تعمیر ہو اور دوسرے لوگ اس سے مستفید ہوں اور بارش کی مثال میں اگر چہ مجموعی طور پر

علاقہ کے لئے مثبت اثرات ظاہر ہوں۔

ہم سطحی اور عام طور پر سانپ کے ڈسنے کو ایک مصیبت اور شر سمجھتے ہیں۔ ہم اس سے غافل ہیں کہ یہی ڈسنا اور زہر اس حیوان کے لئے دفاع کا ایک موثر وسیلہ ہے اور ہم اس سے بے خبر ہیں کہ گاہے اسی زہر سے حیات بخش دوائی بنائی جاتی ہے جو ہزاروں انسانوں کو موت سے نجات دیتی ہے۔

اس لئے اگر ہم مغالطہ سے بچنا چاہیں تو ہمیں اپنی محدود معلومات پر نظر ڈالنی چاہئے اور فیصلہ کرتے وقت صرف اشیاء کے اپنے ساتھ روابط کو مدنظر نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ہمیں تمام جہتوں کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے۔

بنیادی طور پر دنیا کے حوادث زنجیر کی کڑیوں کے مانند آپس میں ملے ہوئے ہیں: آج، ہمارے شہر میں آنے والا طوفان اور سیلاب لانے والی بارش کا برسنا اس طولانی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو دوسرے حوادث کے ساتھ مکمل طور پر مربوط ہے اسی طرح یہ ماضی میں رونما ہوئے اور مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث سے جڑے ہوئے ہیں۔

نتیجہ کے طور پر حوادث کے ایک چھوٹے حصہ پر انگلی رکھ کر اس کے بارے میں فیصلہ کرنا منطق اور عقل کے مطابق نہیں ہے۔

قابل انکار چیز صرف مطلق شر کی خلقت ہے۔ لیکن اگر کوئی چیز کسی جہت سے خیر اور کسی جہت سے شر ہو اور اس کا خیر غلبہ رکھتا ہو تو کوئی مشکل نہیں ہے۔ ایک آپریشن کچھ جہات سے تکلیف دہ اور زیادہ تر جہات سے مفید ہے، اس لئے نسبتاً خیر ہے۔

پھر مزید وضاحت کے لئے زلزلہ کی مثال پر غور کیا جاسکتا ہے: صحیح ہے کہ ایک جگہ پر زلزلہ ویرانی اور تباہی لاتا ہے۔ لیکن اگر ہم دوسرے مسائل سے اس کے سلسلہ وار روابط کو مدنظر رکھیں تو ممکن ہے ہمارا فیصلہ بدل جائے۔

اس سلسلہ میں سائنسدانوں کے مختلف نظریات ہیں کہ زلزلہ زمین کی اندرونی گرمی اور بھاپ سے مربوط ہے یا چاند کی قوت جاذبہ سے مربوط ہے جو زمین کی خشک و جامد سطح کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور کبھی اسے توڑ دیتا ہے، یا دونوں چیزوں سے مربوط ہے؟

لیکن مذکورہ عوامل میں سے جو بھی ہو، اس کے آثار کو مدنظر رکھنا چاہئے۔ یعنی ہمیں جاننا چاہئے کہ

زمین کی اندرونی گرمی ،زمین کے اندر موجود تیل کے ذخائر اور کوئلے کی کانوں اور دوسری چیزوں کی تولید پر کیا اثر ڈالتی ہے؟! اس لئے یہ نسبتاً خیر ہے۔

اس کے علاوہ سمندروں کے مدوجزر، سمندروں کے پانی اور اس میں موجود جانوروں کی حفاظت اور کبھی خشک سواحل کی آبیاری میں کتنے موثر ہیں! یہ بھی نسبتاً خیر ہے۔

یہاں پر ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری سطحی فیصلے اور محدود معلومات ہیں جنھوں نے عالم خلقت کے ان امور کو تاریک کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ہم جس قدر حوادث کے آپسی روابط اور پیوند کے بارے میں زیادہ غور کریں گے اس مطلب کی اہمیت کے بارے میں اتنا ہی زیادہ آگاہ ہوں گے۔

قرآن مجید فرماتا ہے:

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ (سورہ اسراء/ ۸۵)

"اور تمھیں بہت تھوڑا سا علم دیا گیا ہے۔"

لہذا اس تھوڑے سے علم و دانش کے ذریعہ فیصلہ کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔

۲۔ ناخوشگوار اور انتباہ کرنے والے حوادث

ہم نے ایسے افراد کو دیکھا ہے کہ جب وہ کسی نعمت میں غرق ہوتے ہیں تو "خود خواہی اور غرور" سے دوچار ہوتے ہیں اور اس حالت میں بہت سے اہم انسانی مسائل اور اپنے فرائض کو بھول ڈالتے ہیں۔

اور ہم سب نے یہ بھی دیکھا ہے کہ زندگی کے مکمل آرام و آسائش کی حالت میں انسان کس طرح "خواب غفلت" میں پڑ جاتا ہے کہ اگر انسان کی یہ حالت جاری رہی تو وہ بدبختی سے دوچار ہو جاتا ہے۔ بیشک زندگی کے بعض ناخوشگوار حوادث انسان کو غرور و تکبر اور غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے ہیں۔

آپ نے یقیناً سنا ہوگا کہ باتجربہ اور ماہر ڈرائیور صاف و ہموار اور پیچ و خم اور موڑوں سے خالی سڑکوں کے بارے میں اعتراض کرتے ہیں اور اس قسم کی سڑکوں کو خطرناک جانتے ہیں، کیونکہ سڑکوں کا ہموار و یکسان ہونا ڈرائیور کے لئے خواب آور ہونے کا سبب بنتا ہے اور وہ خطرہ سے دوچار ہو سکتا ہے۔

حتی کہ بعض ملکوں میں مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اس قسم کی سڑکوں پر مصنوعی نشیب و فراز (speed breaker) سپیڈ بریکر اور موڑ بنائے جاتے ہیں تاکہ اس قسم کے خطرات کو روکا جا سکے۔

انسان کی زندگی کا راستہ بھی ایسا ہی ہے۔اگر زندگی میں نشیب وفراز اور مشکلات نہ ہوں اور اگر کبھی کبھار نا گوار حوادث پیش نہ آئیں تو انسان کے لئے خدا، اپنے سرانجام اور اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتنا یقینی بن جاتا ہے۔ہم ہرگز یہ نہیں کہتے کہ انسان خود اپنے لئے ناخوشگوار حوادث ایجاد کرے اور مصیبتوں کی طرف بڑھے، کیونکہ انسان کی زندگی میں یہ امور ہمیشہ سے تھے اور رہیں گے، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ اسے توجہ کرنی چاہئے کہ ان حوادث میں سے بعض کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کے غرور وغفلت کے لئے رکاوٹ بنیں کیونکہ یہ چیزیں اس کی سعادت وخوشبختی کی دشمن ہیں۔ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ فلسفہ بعض ناخوشگوار حوادث سے متعلق ہے، نہ کہ تمام حوادث سے متعلق۔باقی حصہ کے بارے میں انشاءاللہ بعد میں بحث کریں گے۔

اس سلسلہ میں ہماری عظیم آسمانی کتاب قرآن مجید میں یوں ارشاد ہوتا ہے:

فَأَخَذْنٰهُمْ بِالْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾

(سورہ انعام/ ۴۲)

"اس کے بعد انھیں سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ شاید ہم سے گڑگڑائیں۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کن لوگوں نے آفات ومصائب کے مسئلہ کو عقائد میں شامل کیا ہے؟

۲۔آفات ومصائب کے کچھ نمونے بیان کیجئے، کیا آپ اپنی زندگی میں کبھی ان سے دوچار ہوئے ہیں؟

۳۔نسبتی اور ہمہ جہت فیصلہ اور "شر مطلق" و "خیر مطلق" کیا ہے؟

۴۔کیا طوفان اور زلزلے یقینا نقصان دہ ہیں؟

۵۔ناخوشگوار حوادث انسان کی زندگی میں کونسے مثبت نفسیاتی اثرات ڈال سکتے ہیں؟

چوتھا سبق: آفات وبلیّات کا فلسفہ (۲)

ہم نے کہا کہ انسانی زندگی میں رونما ہونے والے ناخوشگوار حوادث، آفات، مشکلات اور ناکامیوں پر اعتراض کرنے والوں نے ان چیزوں کو عدل الٰہی سے انکار کرنے کا بہانہ قرار دیا ہے بلکہ بعض اوقات اسی بہانہ سے پروردگار کے وجود کے بھی منکر بن گئے ہیں!

گزشتہ بحث میں ہم نے ان حوادث کے ایک حصہ پر بحث وتحقیق کی اور اس کے دو فلسفوں کی وضاحت کی۔ یہاں پر ہم اسی بحث کو جاری رکھتے ہیں۔

۳۔ انسان مشکلات میں پرورش پاتا ہے

ہم پھر یہ بات کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے ہاتھوں اپنے لئے مشکلات اور حوادث ایجاد نہیں کرنے چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے مواقع پر سخت اور ناخوشگوار حوادث اور مشکلات ہمارے ارادہ کو تقویت بخشنے کا سبب بنتے ہیں، جس طرح لوہا بھٹی میں ڈال کر گرم کیا جاتا ہے اور وہ سرد وگرم جھیل کر پائدار ہوجاتا ہے، اسی طرح ہم بھی حوادث کی بھٹی میں سرد وگرم زمانہ جھیل کر پختہ اور قوی بن جاتے ہیں۔

جنگ ایک بری چیز ہے، لیکن کبھی ایک سخت اور طولانی جنگ ایک ملت کی استعداد کو وسعت بخشتی ہے، اختلافات کو اتحاد ویکجہتی میں تبدیل کرتی ہے اور پسماندگیوں کی تیزی کے ساتھ تلافی کرتی ہے۔

ایک معروف مغربی مورّخ کہتا ہے: "پوری تاریخ میں دنیا کے کسی بھی گوشے میں ہر نمایاں تہذیب کا ظہور، ایک ملک پر کسی بیرونی بڑی طاقت کے حملہ کے بعد رونما ہوتا ہے اور یہی بیرونی حملہ اس ملک کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرکے انھیں منسجم ومتحد کردیتا ہے"

لیکن زندگی کے تلخ حوادث کے مقابلہ میں ہر فرد اور ہر معاشرہ کا ردعمل یکساں نہیں ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان حوادث کے مقابلہ میں یاس وناامیدی اور ضعف وبدظنی کے شکار ہوجاتے ہیں اور منفی نتیجہ حاصل کرتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے پاس مناسب وسائل موجود ہوتے ہیں، وہ ان حوادث کے مقابلہ میں جوش وجذبہ سے حرکت میں آجاتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کی تیزی کے ساتھ اصلاح کرتے ہیں۔

چونکہ ایسے مواقع پر اکثر لوگ سطحی فیصلہ کرتے ہیں اور صرف مشکلات اور سختیوں کو دیکھتے ہیں اس لئے وہ ان کے مثبت اور تعمیری آثار کو نہیں دیکھ پاتے۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کے تمام تلخ حوادث کے ایسے ہی اثرات ہوتے ہیں ،لیکن کم ازکم ان میں سے بعض ایسے ہی ہیں۔

اگر آپ دنیا کے غیر معمولی انسانوں کی زندگی کا مطالعہ کریں گے تو معلوم ہوجائے گا تقریباً وہ سب مشکلات اور سختیوں میں پلے ہیں، ایسے بہت کم لوگ پائے جاتے ہیں، جو عیش وعشرت میں پلے ہوں اور غیر معمولی شخصیت بن کر شہرت پائے ہوں۔فوج کے کمانڈر وہ بنتے ہیں جو سخت اور طولانی میدان کارزار میں اپنے جوہر دکھاتے ہیں۔عظیم اقتصاددان وہ ہوتے ہیں جو بحران زدہ اقتصادی بازاروں میں گرفتار رہے ہیں بڑے اور قدرتمند سیاست دان وہ ہوتے ہیں جو اپنی سیاسی تحریک میں مشکلات سے مقابلہ کرتے ہیں اور سختیاں جھیلتے ہیں۔

مختصر یہ کہ انسان مشکلات اور سختیوں کی آغوش میں پرورش پاتا ہے۔

ہم قرآن مجید میں یوں پڑھتے ہیں:

فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـــًٔا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ۝۱۹

(سورہ نساء/۱۹)

"ہوسکتا ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو اور خدا اسی میں خیر کثیر قرار دے۔"

۴۔مشکلات خدا کی طرف پلٹنے کا سبب ہیں

ہم نے گزشتہ بحثوں میں پڑھا کہ ہمارے وجود کے ہر ایک حصہ کا ایک مقصد ہے۔آنکھ ایک مقصد کے لئے ہے، کان ایک دوسرے مقصد کے لئے ،دل، دماغ اور اعصاب میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مقصد کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، یہاں تک کہ ہماری انگلیوں کی لکیروں میں بھی ایک فلسفہ مضمر ہے۔

اس بنا پر کیسے ممکن ہے کہ ہمارا پورا وجود مقصد اور فلسفہ کے بغیر ہو؟

ہمیں گزشتہ بحثوں میں معلوم ہوا کہ یہ مقصد، انسان کے تمام جہتوں میں تکامل حاصل کرنے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے۔

اس تکامل تک پہنچنے کے لئے یقیناً تعلیم وتربیت کے ایک ایسے عمیق نظام کی ضرورت ہے جو انسان کے پورے وجود پر حاوی ہے۔اسی لئے خداوند متعال نے انسان کو پاک توحیدی فطرت عطا کرنے کے علاوہ عظیم انبیاء کو آسمانی کتابوں کے ساتھ بھیجا تاکہ اس راہ میں انسان کی رہبری کی ذمہ داری نبھائیں۔

اس کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ کبھی کبھی انسان کو اس کے گناہوں اور خطاؤں کا ردعمل دکھایا جائے اور خدا کی نافرمانی کے نتیجہ میں وہ اپنی زندگی میں مشکلات سے دوچار ہوتا کہ اپنے برے اعمال کے نتائج سے آگاہ ہوکر خدا کی طرف پلٹ آئے۔ ایسے ہی مواقع پر بعض بلائیں اور ناخوشگوار حوادث رحمت ونعمت الٰہی ہوتے ہیں۔

جیسا کہ قرآن مجید یاددہانی کرتا ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٤١﴾ (سورہ روم/۴۱)

"لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کی بنا پر فساد خشکی اور تری ہر جگہ غالب آگیا ہے تا کہ خدا ان کے کچھ اعمال کا مزہ چکھادے تو شاید یہ لوگ پلٹ کر راستے پر آجائیں۔"

مذکورہ بیان کے پیش نظر دردناک حوادث کو "شر" کا مصداق جاننا، انھیں "بلائیں" کہنا، اور انھیں عدل الٰہی کے خلاف سمجھنا عقل ومنطق کے خلاف ہے، کیونکہ جتنا ہم اس مسئلہ میں عمیق تر غور کریں گے زیادہ سے زیادہ اس کے اسرار ورموز سے آگاہ ہوں گے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے؟ اس مقصد تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے؟

۲۔ انسان مشکلات کا مقابلہ کر کے کیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند قوی بن سکتا ہے؟

۳۔ کیا آپ نے ایسے افراد کو دیکھا ہے یا تاریخ میں پڑھا ہے جو مشکلات اور سختیوں سے مقابلہ کرنے کے نتیجہ میں عظیم مرتبہ پر فائز ہو چکے ہوں؟ ان کے حالات زندگی بیان کیجئے۔

۴۔ ہمارے گناہوں کے ردعمل کے بارے میں قرآن مجید کیا فرماتا ہے؟

۵۔ تلخ اور ناخوشگوار حوادث سے کون لوگ مثبت نتیجہ حاصل کرتے ہیں اور کون لوگ منفی نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟

پانچواں سبق آفات وبلیّات کا فلسفہ (۳)

چونکہ خدا کی معرفت اور توحید کے مباحث کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے ناخوشگوار آفات و حوادث کی مشکل ایک قابل غور مشکل ہے،اس لئے ہم آفات وحوادث کے بارے میں مزید فلسفوں کو بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں،لہذااس بحث کوآگے بڑھاتے ہیں۔

۵۔مشکلات اورنشیب وفراز زندگی کوروح بخشتے ہیں

شاید بعض افراد کے لئے اس مسئلہ کا ادراک مشکل ہوگا کہ اگر خدا کی نعمتوں کا سلسلہ جاری اور یکساں ہوتو وہ اپنی اہمیت کھودیتی ہیں۔

آج ثابت ہو چکا ہے کہ اگر ایک جسم کوایک کمرہ کے بیچ میں رکھا جائے اور اسپر ہر طرف سے یکساں اور تیز روشنی ڈالی جائے اور خود جسم اور کمرہ بھی مکمل طور پر شفاف اور گول ہوں،تو اس جسم کو ہرگز دیکھا نہیں جا سکتا ہے۔کیونکہ ہمیشہ جب روشنی کے کنارے سائے قرار پاتے ہیں تو وہ جسم کے ابعاد کو مشخص کرتے ہیں اور اسے اپنے اطراف سے جدا کرتے ہیں اور ہم اسے دیکھ سکتے ہیں۔

زندگی کی نعمتوں کی قدر و قیمت بھی مشکلات کے پرُ رنگ اور کم رنگ سایوں کے بغیر قابل مشاہدہ نہیں ہے۔اگر کوئی شخص زندگی بھر کبھی بیمار نہ ہوتو وہ ہرگز صحت وسلامتی کے مزہ کا احساس نہیں کرسکتا ہے۔اس کے برعکس اگر وہ ایک رات کوشدید بخار اور سر درد میں مبتلا ہوجائے اور صبح ہونے پر وہ اس بخار اور سر درد سے نجات پا جائے تو صحت وسلامتی کا مزہ اس کے ذائقہ کواس قدر شیرین کرتا ہے کہ جب کبھی اسے اس بحرانی اور المناک رات کی یاد آتی ہےتو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے پاس صحت وسلامتی نام کا کون سا قیمتی گوہر ہے۔

یکساں زندگی۔حتی خوشحال ترین زندگی۔بالکل تھکا دینے والی،بے روح اور مہلک زندگی ہوتی ہے ۔اکثر مشاہدہ کیا گیا ہے کہ بعض افراد خوشحال اور ہرقسم کے رنج والم سے خالی زندگی سے اس قدر تھک چکے ہیں کہ خودکشی کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں یا ہمیشہ اپنی زندگی کے بارے میں گلہ شکوے کرتے ہیں۔آپ کسی باذوق معمار کو پیدا نہیں کرسکتے ہیں،جوایک بڑے ہال کی دیواروں کوایک زندان کی دیواروں کے مانند صاف اور یکساں تعمیر کرے،بلکہ وہ اس ہال کی دیواروں کو اتار چڑھاؤ اور پیچ وخم کے ساتھ تعمیر کرکے پُرکشش بنادیتا ہے۔

یہ عالم طبیعت کیوں اس قدر خوبصورت ہے؟

پہاڑوں پر موجود جنگلوں کے مناظر اور چھوٹے بڑے درختوں کے بیچ میں سے مار پیچ کے مانند گزرنے والی نہریں کیوں اس قدر خوبصورت اور دل آویز ہوتی ہیں؟!

اس کی ایک واضح وجہ ان کا یکساں نہ ہونا ہے۔

"روشنی" اور "تاریکی"، اور شب وروز کی آمد ورفت کا نظام، جس کا ذکر قرآن مجید نے مختلف آیات میں کیا ہے، اس کا ایک اہم مقصد انسانوں کی یکساں زندگی کو ختم کرنا ہے، کیونکہ اگر سورج آسمان کے ایک کونے سے یکساں اور مسلسل طور پر کرۂ زمین پر اپنی روشنی پھیلاتا اور نہ اپنی حالت میں تبدیلی لاتا اور نہ اس کی جگہ رات کا پردہ پڑتا، تو دوسرے مشکلات کے علاوہ، تھوڑی ہی مدت میں سب انسان تھک جاتے۔

اس وجہ سے ماننا چاہئے کہ کم ازکم زندگی کے بعض ناخوشگوار حوادث اور مشکلات میں یہ فلسفہ ہے کہ یہ بقیہ زندگی کو روح بخشتے ہیں اسے شیرین اور قابل برداشت بناتے ہیں، نعمتوں کی قدر وقیمت کو واضح کر دیتے ہیں اور انسانوں کے لئے یہ ممکن بناتے ہیں کہ موجودہ نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

٦۔خودساختہ مشکلات

ایک اور نکتہ، جس کی طرف ہم اس بحث کے اختتام پر اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، یہ ہے کہ بہت سے لوگ ناخوشگوار حوادث اور مصائب کے عوامل کا محاسبہ کرنے میں بعض اوقات مغالطہ کا شکار ہوجاتے ہیں اور ظالم انسانوں کے ذریعہ وجود میں آئے ظلم کو خلقت کے نظام کی ناانصافی جانتے ہیں اور انسان کے کام کی بد نظمی کو خلقت کی بدنظمی شمار کرتے ہیں۔

مثلاً کبھی اعتراض کرتے ہیں کہ مصیبت زدہ پر ہی کیوں مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں؟! زلزلوں میں کیوں شہروں میں نقصانات کم ہوتے ہیں اور گاؤں میں زیادہ قربانیاں رونما ہوتی ہیں اور بہت سے لوگ ملبے میں پھنسے رہ جاتے ہیں، یہ کونسا انصاف ہے؟ اگر کوئی مصیبت قسمت میں طے ہو تو کیوں یکساں نہیں آتی؟

دردناک حادثات سے کیوں اکثر مستضعفین (کمزور لوگ) دوچار ہوتے ہیں؟ اور وبائی بیماروں کے کیوں یہی لوگ زیادہ تر شکار ہوتے ہیں؟

جبکہ حقیقت میں ان میں سے کوئی بھی چیز خلقت کے نظام اور خدا کی خلقت اور عدالت سے مربوط نہیں ہے، بلکہ یہ خود انسانوں کے ایک دوسرے پر ظلم واستعمار کا نتیجہ ہوتا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اگر گاؤں والے شہر نشینوں کے ظلم کی وجہ سے فقر ومحرومیت سے دو چار نہ ہوتے اور اپنے لئے مضبوط مکانات تعمیر کرسکتے تو وہ زلزلہ میں زیادہ نقصانات سے کیوں دو چار ہوتے اور دوسرے کم؟

لیکن جب ان کے گھر معمولی مٹی، پتھر اور لکڑی کے بنے ہوں اور ان میں چونا اور سمینٹ کا نام تک نہ ہو اور ہوا کے ایک جھونکے یا معمولی زلزلہ سے زمین بوس ہوجائیں تو انھیں اس سے بہتر حالت کی توقع نہیں کرنی چاہئے، لیکن اس کا خدا کے کام سے کیا ربط ہے؟

ہمیں اس شاعر کے مانند اعتراض نہیں کرنا چاہئے، جس نے کہا ہے:

یکے را دادہ ای صد نازو نعمت

ایک کو سو نعمتیں عطا کی ہیں اور دوسرے کو خاک ذلت پر بٹھا دیا ہے،

ایک کو محل کو عطا کئے ہیں اور دوسرے کو جھونپڑی!

حقیقت میں یہ اعتراض معاشرہ کے غیر عادلانہ اور غلط نظام پر کئے جانے چاہئے۔ ہمیں ان اجتماعی ناانصافیوں کا خاتمہ کرنا چاہئے فقر وپسماندگی سے مقابلہ کرنا چاہئے اور مستضعفین کو ان کے حقوق دینے چاہئے تاکہ معاشرہ میں اس قسم کے حالات پیدا نہ ہونے پائیں۔

اگر معاشرہ کے تمام لوگوں کو مناسب غذا، صحت اور طبی خدمات ملیں تو وہ عام بیماریوں کے مقابلہ میں مقاومت پیدا کریں گے۔

لیکن جب ایک معاشرہ کا غلط اجتماعی نظام اور اس پر حاکم استکبار ایک شخص کے لئے اس قدر وسائل فراہم کرے کہ اس کے پالتو کتے اور بلی کے لئے بھی مخصوص ڈاکٹر معین ہو اور اس کے مقابلہ میں دوسرے کے ایک نوزاد بچے کے لئے بھی صحت وسلامتی کے ابتدائی وسائل مہیا نہ ہوں تو اس قسم کے ناخوشگوار حالات زیادہ رونما ہوتے ہیں۔

ایسے حالات میں ہمیں خدا کے کام پر اعتراض کرنے کے بجائے خود اپنے ہی کام پر اعتراض کرنا چاہئے۔

ہمیں ظالم سے کہنا چاہئے کہ ظلم نہ کرے۔

ہمیں مظلوم سے کہنا چاہئے کہ ظلم برداشت نہ کرے!

ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ معاشرے کے ہر فرد کو کم از کم صحت وصفائی، علاج ومعالجہ، کھانے پینے، رہائشی، ثقافتی اور تعلیم وتربیت کے ابتدائی ضروریات سے بہرہ مند ہونا چاہئے۔

مختصر یہ کہ ہمیں اپنے گناہوں کو خلقت کے نظام کی گردن پر نہیں ڈالنا چاہئے۔

خداوند متعال نے ہم پر کب ایسی زندگی مسلط کی ہے؟ اور کہاں پر اس قسم کے نظام کی تعریف کی ہے؟

اس نے ہمیں آزاد خلق کیا ہے، کیونکہ آزادی ہمارے تکامل اور ارتقا اور ترقی کا راز ہے۔

لیکن ہم اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور دوسروں پر ظلم وستم کرتے ہیں اور یہی ظلم وستم معاشرہ کی بدحالی کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

افسوس کہ بہت سے لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہوئے ہیں، یہاں تک کہ معروف ومشہور شعراء کے اشعار میں بھی اس کے نمونے ملتے ہیں۔

قرآن مجید ایک مختصر اور بامعنی جملہ میں فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ۝۴۴

(سورہ یونس/ ۴۴)

"اللہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا کرتے ہیں۔"

اب ہم آفات وبلیّات کے فلسفہ کی بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک طولانی موضوع ہے لیکن ہم اسی مختصر بحث پر اکتفا کرتے ہیں۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ آفات وبلیّات کے فلسفہ کی بحث کو ہم نے کیوں تین اسباق میں بیان کیا؟

۲۔ زندگی کے یکساں ہونے میں کون سے بُرے اثرات ہیں؟ کیا آپ نے کسی کو دیکھا ہے جو اپنی عیش وعشرت کی زندگی سے بیزار ہو؟

۳۔ کائنات میں نور وظلمت کے نظام کے فلسفہ کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۴۔ کیا معاشرے میں موجود تمام مصیبتیں خلقت کے نظام سے مربوط ہیں یا ان کے ہم بھی ذمہ دار ہیں؟

۵۔ کیا معاشرے کی مصیبتوں کو ختم کرنے کے لئے کوئی صحیح طریقہ موجود ہے؟ مستضعفین کے بارے میں ہماری کیا ذمہ داری ہے؟

عدل الٰہی کے دس سبق

چھٹا سبق: جبر واختیار کا مسئلہ

پروردگار عالم کی عدالت سے مربوط مسائل میں سے ایک مسئلہ "جبر واختیار" کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ عقیدۂ جبر کے قائل لوگوں کے نزدیک انسان کو اپنے اعمال، رفتار اور گفتار پر کسی قسم کا اختیار نہیں ہے اور اس کے اعضاء کی حرکات ایک مشین کے پرزوں کے مانند ہیں۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ عدال الٰہی سے کیا مناسبت رکھتا ہے؟ شاید اسی وجہ سے اشاعرہ نے، جن کے بارے میں ہم نے گزشتہ سبق میں ذکر کیا اور وہ حسن وقبح عقلی کے منکر ہیں، جبر کو قبول کر کے عدل الٰہی سے انکار کیا ہے۔ کیونکہ جبر کو قبول کرنے کی صورت میں "عدالت" کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہ جاتا ہے۔

اس بحث کو واضح کرنے کے لئے چند موضوعات کی دقیق وضاحت کرنا ضروری ہے:

ا۔ جبر کے عقیدہ کا سرچشمہ

ہر شخص اپنے وجود کی گہرائیوں میں احساس کرتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ میں آزاد ہے، مثال کے طور پر فلاں دوست کی وہ مالی مدد کرے یا نہ کرے یا یہ کہ پیاس کی حالت میں اگر اس کے سامنے پانی رکھا جائے تو وہ اسے پئے یا نہ پئے۔ اگر کسی نے اس کے خلاف کوئی ظلم کیا ہو تو وہ اسے بخش دے یا نہ بخشے۔

یا یہ کہ ہر شخص بڑھاپے یا بیماری کی وجہ سے کانپنے والے ہاتھ اور اپنے ارادہ سے حرکت کرنے والے ہاتھ کے درمیان فرق کر سکتا ہے۔

آزادی ارادہ کا مسئلہ انسان کا ایک عام احساس ہونے کے باوجود کیوں انسانوں کا ایک گروہ جبر کا عقیدہ رکھتا ہے؟!

اس کے مختلف اسباب ہیں کہ ہم ان میں سے ایک اہم سبب کو یہاں پر بیان کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان مشاہدہ کرتا ہے کہ ماحول افراد پر اثر ڈالتا ہے، تربیت بھی ایک دوسری علت ہے اسی طرح

پروپیگنڈے، ذرائع ابلاغ اور سماجی ماحول بھی بلا شبہ انسان کی فکر و روح پر اثر انداز ہوتے ہیں۔کبھی اقتصادی حالات بھی انسان میں تبدیلیاں ایجاد کرنے کا سبب بنتے ہیں۔وراثت کے سبب ہونے سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہ تمام عوامل اس کا سبب بنتے ہیں کہ انسان یہ خیال کرے کہ ہم با اختیار نہیں ہیں بلکہ ہمیں داخلی اور خارجی ذاتی عوامل اکھٹے ہو کر مجبور کرتے ہیں کہ ہم کچھ ارادے اور فیصلے کریں، اگر یہ عوامل نہ ہوتے تو ہم سے بہت سے کام سرزد نہیں ہوتے۔یہ ایسے امور ہیں، جنھیں ماحول کے جبر، اقتصادی حالات کے جبر، تعلیم وتربیت کے جبر اور وراثت کے جبر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ان عوامل میں سے "مکتب جبر" فلاسفہ کی زیادہ توجہ کا مرکز بنا ہے۔

۲۔جبریوں کی غلط فہمی کی اصل وجہ

لیکن جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ ایک بنیادی بات سے غافل ہیں اور وہ یہ ہے کہ بحث "محرکات وعوامل" اور "علت ناقصہ" کے بارے میں نہیں ہے بلکہ بحث "علت تامّہ" میں ہے۔دوسرے الفاظ میں: کوئی شخص انسان کی فکر اور اس کے عمل میں ماحول، تہذیب وتمدن اور اقتصادی اسباب کے اثر انداز ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے۔اصل بحث اس میں ہے کہ ان تمام اسباب کے باوجود فیصلہ کا اختیار ہم ہی کو ہے۔

کیونکہ ہم واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ سابقہ شہنشاہی نظام جیسے ایک غلط اور طاغوتی نظام میں بھی گمراہ ہونے کے مواقع فراہم تھے، لیکن ہم اس کے لئے مجبور نہیں تھے۔ہمارے لئے اسی نظام اور ماحول میں بھی ممکن تھا کہ ہم رشوت لینے سے پرہیز کریں، فحاشی کے مراکز کی طرف رخ نہ کریں اور آزادروی سے پرہیز کریں۔

لہذا ان مواقع کو "علت تامّہ" سے جدا کرنا ضروری ہے۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے افراد غیر مہذب گھرانوں اور برے ماحول میں پرورش پانے یا نامناسب وراثت کے مالک ہونے کے باوجود اپنے لئے صحیح راہ کا انتخاب کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض اوقات یہی افراد اس قسم کے ماحول اور نظام کے خلاف انقلاب برپا کر کے اسے بدل دیتے ہیں، ورنہ اگر یہ ضروری ہوتا کہ تمام انسان ماحول، تہذیب وتمدن اور پروپیگنڈے کے تابع ہوں تو دنیا میں کبھی کوئی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا اور تمام افراد ماحول کے سامنے ہتھیار ڈال کر جدید ماحول پیدا کرنے سے قاصر رہتے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام مذکورہ عوامل میں سے کوئی ایک بھی "تقدیر ساز" نہیں ہے بلکہ یہ اسباب صرف مواقع فراہم کرتے ہیں اور انسان کی تقدیر کو صرف اس کا ارادہ اور عزم بناتا ہے۔

یہ ایسا ہی ہے کہ ہم ایک انتہائی گرم موسم میں خدا کی اطاعت کرتے ہوئے روزے رکھنے کا عزم کریں جبکہ ہمارے وجود کے تمام ذرات پانی کی خواہش کرتے ہیں لیکن ہم خدا کی اطاعت میں ان کی پروا نہیں کرتے جبکہ ممکن ہے کوئی دوسرا شخص حکم خدا کے باوجود اس خواہش کو قبول کر کے روزہ نہ رکھے۔

نتیجہ کے طور پر ان تمام "اسباب وعوامل" کے باوجود انسان کے پاس عزم وارادہ جیسی ایک چیز ہے جس سے وہ اپنا مقدر بنا سکتا ہے۔

۳۔مکتب جبر کے سماجی اور سیاسی اسباب

حقیقت یہ ہے کہ ابتدا سے ہی "جبر واختیار" کے مسئلہ کے بارے میں کثرت سے غلط فائدہ اٹھایا گیا ہے۔انسان کے ارادہ کی آزادی کی "نفی" اور جبر کے عقیدہ کی تقویت کے لئے کچھ خاص عوامل کا ایک سلسلہ بھی موثر کردار ادا کرتا رہا ہے۔ان میں سے بعض حسب ذیل ہیں:

الف: سیاسی عوامل

بہت سے جابر وستمگر حکام محروم اور مستضعف لوگوں کے انقلابی جذبہ کو خاموش کرنے اور اپنی غیر قانونی اور مطلق العنان حکومت کو باقی رکھنے کے لئے ہمیشہ اس فکر کا سہارا لیتے رہے ہیں کہ ہم خود کوئی اختیار نہیں رکھتے،تقدیر کا ہاتھ اور تاریخ کا جبر ہماری قسمت کا فیصلہ کرنے والا ہے۔اگر کوئی امیر ہے اور کوئی غریب تو یہ قضاوقدر کے حکم یا تاریخ کے جبر کے سبب سے ہے!

واضح ہے کہ اس قسم کا طرز فکر کس حد تک لوگوں کے افکار کو بے حس کر سکتا ہے اور جابر حکام کی استعماری اور آمرانہ سیاست کی مدد کر سکتا ہے؟ حالانکہ عقلی اور شرعی طور پر ہماری "تقدیر" خود ہمارے ہاتھوں میں ہے اور "جبر" کے معنی میں قضاوقدر کا بالکل وجود نہیں ہے۔الٰہی قضاوقدر کی تعیین ہماری حرکات،خواہشات ،ارادہ،ایمان،جستجو اور کوشش کے مطابق ہوتی ہے۔

ب۔نفسیاتی عوامل

جو کاہل اور سست افراد اپنی زندگی میں اکثر ناکام رہتے ہیں وہ ہرگز اس بات کو قبول نہیں کرتے ہیں کہ ان کی

سستی اور خطائیں ان کی شکست کا سبب بنی ہیں۔ لہذا اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لئے "مکتب جبر" کا سہارا لیتے ہیں اور اپنی ناکامی کو اپنی اجباری قسمت کے سر پر ڈالتے ہیں تاکہ اس طرح جھوٹا اور ظاہری سکون پیدا کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں: کیا کریں ہماری قسمت کی چادر تو روز اول سے ہی ایسی سیاہ بنُ گئی ہے جسے زمزم یا حوض کوثر کا پانی بھی سفید نہیں کر سکتا۔ ہم با استعداد بھی ہیں اور ہم نے کوشش بھی کی ہے لیکن افسوس ہماری قسمت نے ہمارا ساتھ نہیں دیا!

ج۔ سماجی عوامل:

بعض لوگ چاہتے ہیں کہ وہ آزادی کے ساتھ ہوا و ہوس کی راہوں پر چلتے رہیں اور اپنی حیوانی خواہشات کے مطابق ہر گناہ کے مرتکب ہوتے رہیں اس کے باوجود خیال کرتے ہیں کہ وہ گناہ کار نہیں ہیں اور سماج میں بھی اس قسم کا تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ بے گناہ ہیں۔

اس لئے وہ "عقیدہ جبر" کا سہارا لے کر اپنی ہوس رانی کی جھوٹی توجیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: ہمیں اپنے کاموں میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے!

لیکن بخوبی جانتے ہیں کہ یہ سب جھوٹ ہے، حتی اس قسم کی باتیں کرنے والے بھی جانتے ہیں کہ ان کے یہ عذر بے بنیاد ہیں۔ لیکن عارضی لذتیں اور ناپائیدار منافع انھیں حقیقت کا کھلم کھلا بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔

لہذا ضروری ہے کہ سماج کو اس جبری طرز فکر سے اور قسمت و تقدیر کو جبر کا نتیجہ قرار دینے کے عقیدہ سے بچانے کے لئے کوشش کی جائے۔ کیونکہ اس قسم کا عقیدہ سامراجی طاقتوں کا آلہ کار اور جھوٹی ناکامیوں کے لئے مختلف بہانوں کا وسیلہ اور سماج میں آلودگی بڑھانے کا بہت بڑا سبب بنتا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ "جبر" اور "اختیار" کے نظریہ میں کیا فرق ہے؟

۲۔ جبر کا عقیدہ رکھنے والے افراد کس دلیل پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں؟

۳۔ ماحول، تہذیب و تمدن اور وراثت کے اثرات کا جواب کیا ہے؟

۴۔ ان سیاسی، نفسیاتی اور سماجی عوامل کی وضاحت کیجئے جن کی جھوٹی توجیہ کے لئے عقیدۂ جبر کا سہارا لیا جاتا ہے۔

۵۔ ان عوامل کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟

ساتواں سبق:

ارادہ واختیار کی آزادی پر واضح ترین دلیل

ا۔انسان کا ضمیر جبر کی نفی کرتا ہے

اگر چہ الٰہی فلاسفہ اور علماء نے انسان کے ارادہ میں آزاد ہونے کے سلسلہ میں گونا گوں دلائل پیش کئے ہیں، مگر ہم اختصار کے پیش نظر ان دلائل میں سے ایک واضح ترین دلیل کو پیش کرتے ہیں اور یہ دلیل "انسان کا ضمیر" ہے۔

ہم ہر چیز کا انکار کر سکتے ہیں، لیکن اس بات کا انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ ہر معاشرے میں۔ چاہے وہ خدا پرستوں کا معاشرہ ہو یا مادہ پرستوں کا، مشرقی ہو یا مغربی، قدیم ہو یا جدید، امیر ہو یا غریب، ترقی یافتہ ہو یا پسماندہ، معاشرے میں موجود ہر قسم کے افراد اس بات پر متفق ہیں کہ۔ایک ایسے" قانون" کا ہونا ضروری ہے کہ جو معاشرے پر حاکم ہو اور لوگ اس قانون کی پیروی میں اپنی" ذمہ داری" پوری کریں اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے کو" سزا" دی جائے۔

مختصر یہ کہ" قانون" کی حاکمیت، عوام کی طرف سے قانون کا احترام اور اس کی" ذمہ داری" اور اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اس کی" سزا" جیسے مسائل پر دنیا کے تمام عقلاء کا اتفاق ہے، البتہ صرف وحشی اور غیر مہذب اقوام ان تینوں باتوں کو قبول نہیں کرتے۔

یہ مسئلہ، جسے ہم" تمام دنیا کے افراد کے ضمیر" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں، انسان کے اپنے ارادہ میں آزاد ہونے پر واضح ترین دلیل ہے۔

یہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ وعمل میں مجبور ہو اور کسی قسم کا اختیار نہ رکھتا ہو لیکن قوانین کا احترام اور ذمہ داری اس کے لئے ضروری ہو اور قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر اس سے باز پرس بھی ضروری ہو کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور ایسا کیوں نہیں کیا؟

اور خلاف ورزی ثابت ہونے پر کبھی اس کو جیل کی سزا اور کبھی سزائے موت کا بھی سامنا

کرنا پڑے۔

اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ ہم پہاڑوں سے پھسل کرسڑک پر گرنے والے پتھروں، جومسافروں کی ہلاکت کا سبب بن جاتے ہیں، کوعدالت میں لاکران کے خلاف مقدمہ چلائیں۔

یہ صحیح ہے کہ بظاہر ایک انسان اور پتھر کے ٹکڑے کے درمیان بہت فرق ہے۔لیکن اگر ہم انسان کواپنے ارادہ میں آزاد نہ جانیں تو یہ فرق بالکل ختم ہوجاتا ہے،جس کے نتیجہ میں انسان اور پتھر دونوں جبری عوامل کے تابع ہوجائیں گے۔ پتھر قانون جاذبہ کے تحت سڑک کے بیچ میں آگرتا ہے اور انسان جبری عوامل کی وجہ سے مجرم، قاتل اور سرکش بن جاتا ہے۔عقیدۂ جبر کے قائل افراد کے مطابق ان دونوں کے درمیان کسی بھی قسم کا فرق نہیں ہے اور چونکہ کسی نے اپنے ارادہ سے کام انجام نہیں دیا ہے،لہذا ایک کوعدالت کی کچہری میں کھڑا کرنا اور دوسرے کو چھوڑ دینا کیسے صحیح ہوگا؟!

ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں: یا تمام افراد کے عمومی ضمیر کو غلط اور خطا قرار دیں اور تمام قوانین ،عدالتوں، مجرمین کو دی جانے والی سزاؤں کو بیہودہ، بلکہ ظالمانہ کام قرار دیں یا پھر" عقیدہ جبر" کا انکار کریں۔

بیشک دوسری ہی بات قابل ترجیح ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ فلسفی عقیدہ وتفکر کے لحاظ سے عقیدۂ جبر کا دم بھرنے والے افراد بھی جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو وہ عملی طور پر" آزادی ارادہ" کے عقیدہ پر عمل کرتے ہیں!

کیونکہ اگر کوئی شخص ان کے حقوق کو پامال کرے یا ان کو تکلیف پہنچائے تو اس کو سزا کا مستحق سمجھتے ہیں اور عدالت میں جا کر اس کے خلاف شکایت کرتے ہیں اور کبھی اتنا چیختے چلّاتے ہیں کہ جب تک اس کو سزا نہ مل جائے، چین سے نہیں بیٹھتے۔

پس اگر انسان اپنے ارادہ میں آزاد نہیں ہے تو یہ سرزنش، شکایت اور شور وغوغا اور داد وفریاد کس لئے کرتا ہے؟!

بہر حال دنیا کے عقلا کا عمومی ضمیر اس بات پر زندہ دلیل ہے کہ" ارادہ کی آزدی" کی حقیقت کا اقرار تمام انسان اپنے دل کی گہرائیوں سے کرتے ہیں اور ہمیشہ اس کے حامی اور طرفدار رہے ہیں اور اپنی زندگی کا ایک دن بھی اس عقیدہ کے بغیر نہیں گزار سکتے ہیں اور اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کو اس کے بغیر نہیں چلا سکتے ہیں۔

عظیم اسلامی فلاسفر، "خواجہ نصیرالدین طوسی" جبر واختیار کی بحث کے دوران ایک مختصر اور جامع عبارت میں فرماتے ہیں:

"والضرورة فاضية باستناد افعالنا الينا"(تحریر العقائد، بحث جبر واختیار)

"ہمارا ضمیر اس بات کا متقاضی ہے کہ ہمارے تمام اعمال خود ہم سے مربوط ہیں۔"

۲۔"جبر" کی منطق کا مذہب کی منطق سے تضاد

مذکورہ گفتگو کا تعلق اس بات سے تھا کہ جبر کا عقیدہ دنیا کے عقلاء کے عمومی ضمیر سے تضاد رکھتا ہے خواہ یہ عقلاء کسی مذہب کے ماننے والے ہوں یا لامذہب۔

لیکن ہم مذہبی طرز فکر کے لحاظ سے بھی ایسے قطعی اور یقینی دلائل رکھتے ہیں جو عقیدۂ جبر کے باطل ہو نے پر دلالت کرتے ہیں۔ کیونکہ مذہبی عقائد ہرگز جبر کے عقیدہ کے موافق نہیں ہیں کیونکہ عقیدۂ جبر کو قبول کر نے کی صورت میں مذہبی اصول وقوانین بھی مخدوش ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ ہم گزشتہ بحث میں واضح طور پر ثابت کئے گئے عدل الٰہی کو جبر کے عقیدہ کی روشنی میں ثابت نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال کسی کو برا کام انجام دینے پر مجبور کرے اور پھر اس کو ایسا کام انجام دینے کے جرم میں سزا دے اور باز پرس کرے کہ کیوں یہ کام انجام دیا؟ یہ کسی بھی منطق وعقل کے مطابق نہیں ہے!

لہذا جبر کے عقیدہ کو قبول کر نے کی صورت مین ثواب وعقاب اور جنت وجہنّم بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔

اس کے علاوہ قرآن مجید کی آیات میں نامہ اعمال، سوال و جواب، الٰہی حساب، بدکاروں کی مذمت اور صالحین کی ستائش میں ذکر ہوئے مفاہیم بھی بے معنی ہو جائیں گے۔ کیونکہ اس عقیدہ کی بنیاد پر نیک اور بدکار افراد کے ارادہ واختیار میں کچھ نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ہم مذہب میں سب سے پہلے انسان کی "تکلیف اور ذمہ داری" سے مواجہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر انسان مجبور ہو تو کیا پھر اس "تکلیف اور ذمہ داری" کا کوئی مطلب اور مفہوم ہے؟!

کیا ہم رعشہ کے مرض میں مبتلا کسی مریض کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے ہاتھ کی تھرتھراہٹ کو روک لے یا کسی ترائی میں پھسلنے والے شخص کو کہہ سکتے ہیں کہ رک جائے؟

یہی وجہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام ایک مشہور روایت میں مکتب جبر کو بت پرستوں

اورشیطان کی جماعت کا مکتب قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تلك مقاله اخوان عبدة الاوثان وحضماء الرحمان وحزب الشيطان"

(اصول کافی ج۱،ص۱۱۹باب جبروالقدر)

"یہ بت پرستوں کے بھائیوں،خدا کے دشمنوں اورشیطان کے گروہ کی باتیں ہیں۔"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔جبر کے بطلان کی واضح ترین دلیل کیا ہے؟

۲۔ارادہ کی آزادی کے سلسہ میں دنیا کے لوگوں کے ضمیر کی وضاحت کیجئے۔

۳۔کیا جبر کا عقیدہ رکھنے والے عملی طور پر بھی "جبر" کے مطابق عمل کرتے ہیں؟

۴۔کیا "جبر کا عقیدہ" عدل الٰہی کے موافق ہے؟اگر نہیں تو کیوں؟

۵۔ارادہ کی آزادی ہر قسم کی ذمہ داریوں کو قبول کرنے کی بنیاد کس طرح ہے؟

آٹھواں سبق

"امر بین الامرین" (یا وسطی مکتب) کیا ہے؟

ا۔"جبر" کے مقابلہ میں "عقیدۂ تفویض"

افراط پر مبنی "عقیدۂ جبر" کے مقابلہ میں "تفویض" کے نام سے ایک دوسرا مکتب موجود ہے۔ یہ مکتب "تفریط" پر مبنی ہے۔

عقیدۂ تفویض کے معتقد افراد کا کہنا ہے: خداوند متعال نے ہمیں پیدا کرنے کے بعد تمام کام ہمارے سپرد کر دیئے ہیں اور اب خدا کا ہمارے اعمال وافعال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہذا ہم اپنے اعمال کے قلمرو میں مکمل اور مستقل طور پر آزاد اور حاکم ہیں!

بیشک، یہ عقیدہ بھی "عقیدۂ توحید" کے بالکل موافق نہیں ہے، کیونکہ "توحید" نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ تمام کائنات خدا کی ملکیت ہے اور کوئی چیز اس کی دسترس سے خارج نہیں ہے، حتی کہ ہمارے اعمال ہمارے ارادہ کی آزادی کے باوجود اس کی دسترس اور قدرت سے ہرگز باہر نہیں ہو سکتے ورنہ شرک لازم آئے گا۔

واضح تر عبارت میں: ہم دو خداؤں کے قائل نہیں ہو سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک بڑا خدا ہو جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے اور دوسرا چھوٹا خدا یعنی "انسان" جو اپنے تمام اعمال وافعال میں اس قدر آزاد اور با اختیار ہے کہ خداوند متعال بھی اس کے اعمال وافعال پر اثر انداز نہیں ہوسکتا!

یہ واضح شرک ہے اور دو یا چند خداؤں کی پرستش ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ہم انسان کو آزاد اور با اختیار بھی تسلیم کریں اور خداوند متعال کو اس پر اور اس کے اعمال پر حاکم بھی مانیں۔

۲۔درمیانی مکتب

باریک نکتہ یہی ہے کہ ہم یہ خیال نہ کریں کہ ان مذکورہ دو باتوں کے درمیان تضاد موجود ہے۔ اس امر میں گہری فکر کی ضرورت ہے کہ ہمیں خداوند متعال کی "عدالت" کو بھی مکمل طور پر قبول کرنا چاہئے، اس کے

بندوں کے لئے "آزادی" اور "ذمہ داری" کا بھی قائل ہونا چاہئے ،اس کے علاوہ پوری کائنات پر اس کی حاکمیت اور توحید کا بھی قائل ہونا چاہئے اور یہ وہی چیز ہے جسے "امر بین الامرین" سے تعبیر کیا گیا ہے۔(یعنی وہ عقیدہ جو افراط وتفریط کے درمیان واقع ہوا ہے)

چونکہ یہ بحث ذرا پیچیدہ اور دقیق ہے، لہذا ہم اس کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔

فرض کیجئے آپ بجلی سے چلنے والی ایک ریل گاڑی میں سفر کر رہے ہیں اور اس ٹرین کے ڈرائیور بھی آپ ہی ہیں۔ٹرین کے پورے راستہ پر بجلی کا ایک قوی تار کھینچا گیا ہے اور ٹرین کی چھت پر لگا ہوا ایک مخصوص دائرہ (کڑا) بجلی کے اس تار سے ملا ہوا ہے اور حرکت کر رہا ہے اور لحظہ بہ لحظہ بجلی کو ایک قوی مرکز سے ٹرین کے انجن میں اس طرح منتقل کر رہا ہے کہ اگر ایک لحظہ کے لئے بھی اس قوی مرکز سے ٹرین تک بجلی نہ پہنچے تو ٹرین فوراً رک جائے گی۔

اس ٹرین کے ڈرائیور کی حیثیت سے بیشک آپ آزاد ہیں کہ راستے میں جہاں پر بھی چاہیں ٹرین کو روک سکتے ہیں،اسے آہستہ یا تیز چلا سکتے ہیں لیکن اس تمام آزادی کے باوجود بجلی کے مرکز یعنی بجلی گھر میں بیٹھا ہوا شخص جب چاہے بجلی کو منقطع کر کے آپ کی ٹرین کو روک سکتا ہے۔کیونکہ آپ کی ٹرین کی حرکت بجلی کی مرہون منت ہے اور اس کی چابی مرکز برق میں بیٹھے ہوئے شخص کے ہاتھ میں ہے۔

اس مثال میں غور کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ ٹرین کا ڈرائیور تمام تر آزادی،اختیار اور ذمہ داری کے باوجود کسی اور کے کنٹرول میں ہے اور یہ دونوں امر ایک دوسرے کے منافی نہیں ہیں۔

دوسری مثال:

فرض کیجئے کوئی شخص کسی بیماری یا حادثہ کی وجہ سے اپنے ہاتھوں کے اعصاب سے محروم ہو جاتا ہے اور اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے پر قادر نہیں ہوتا ہے۔اگر اس کے اعصاب کو ایک خفیف اور ملایم برقی رو سے ارتباط دیا جائے تو اس کے اعصاب گرم ہو کر دوبارہ حرکت میں آسکتے ہیں۔اب یہ شخص اسی ہاتھ سے کوئی بھی کام انجام دے سکتا ہے۔مثلاً اگر یہ شخص اسی ہاتھ سے کہ جس سے برقی رو کا اتصال ہے کسی پر ظلم کرے،کسی کے چہرے پر طمانچہ مارے یا کسی بے گناہ کے سینے میں چھرا گھونپ دے تو وہ اپنی اس حرکت پر یقینا جواب دہ ہوگا۔کیونکہ اس نے اپنی قدرت اور اختیار سے اس کام کو انجام دیا ہے۔اور قادر و مختار شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہوتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس انسان کے ہاتھ میں برقی رو داخل کرنے والا شخص بھی اس پر حاکمیت رکھتا ہے اور یہ انسان اپنی تمام آزادی واختیار کے باوجود اس کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

اب ہم اصلی مطلب کی طرف پلٹتے ہیں:

خداوندمتعال نے ہمیں ہمت اور طاقت عطا کی ہے، ہمیں عقل وہوش اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے۔ یہ تمام وسائل ہمیں لحہ بہ لحہ خداوندمتعال کی طرف سے عطا ہورہے ہیں اگر ایک لحہ کے لئے بھی خداوند متعال کا لطف وکرم ہم پر رک جائے اور اس سے ہمارا رابطہ منقطع ہوجائے تو ہم نابود ہوکر رہ جائیں گے۔

اگر ہم کوئی کام انجام دیتے ہیں تو یہ اسی کی طرف سے عطا کردہ قوت کے نتیجہ میں ہے جو لحہ بہ لحہ جاری ہے حتی کہ ہماری آزادی اور اختیار بھی اسی کی طرف سے عطا کی ہوئی نعمت ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ہم آزاد ہوں اور اس کی عظیم نعمتوں کے سایہ میں کمال کی منزل تک پہنچنے کا راستہ طے کریں۔

پس ہم اختیار اور ارادہ کی آزادی کے باوجود اس کے قبضہ قدرت میں ہیں اور اس کی بارگاہ میں سر جھکائے ہوئے ہیں اور اس کی حاکمیت کے قلمرو سے باہر نہیں ہوسکتے۔ ہم تمام تر قدرت اور توانائی کے باوجود اسی کے مرہون منت ہیں اور اس کے بغیر کچھ بھی نہیں ہیں۔ "الامر بین الامرین" کا یہی معنی ومفہوم ہے، کیونکہ ہم نے کسی بھی موجود کو اس کے مثل قرار نہیں دیا ہے کہ شرک لازم آئے اور نہ ہی خدا کے بندوں کو ان کے اعمال میں مجبور جانتے ہیں کہ ظلم لازم آئے۔ (غور فرمایئے!)۔

ہم نے یہ درس مکتب اہل بیت علیہم السلام سے حاصل کیا ہے، کیونکہ ان حضرات سے سوال کیا جاتا تھا کہ کیا جبر وتفویض کے درمیان کوئی تیسرا راستہ بھی ہے؟ تو وہ فرماتے تھے:

"ہاں، تیسرا راستہ بھی موجود ہے جو زمین وآسمان کے درمیان فاصلہ سے وسیع تر ہے۔" (اصول کافی: ج۱،ص۱۲۱ باب الجبر والقدر والامر بین الامرین)

۳۔قرآن مجید اور جبر واختیار کا مسئلہ

قرآن مجید انسان کے ارادہ میں آزادی کے مسئلہ کو واضح طور پر ثابت کرتا ہے اور اس سلسلہ میں قرآن مجید میں سینکڑوں آیات ذکر ہوئی ہیں۔

الف۔ وہ تمام آیات جن میں امر ونہی، ذمہ داریوں اور اصول وقوانین کا ذکر کیا گیا ہے، اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ انسان اپنے ارادہ واختیار میں آزاد ہے، کیونکہ اگر انسان آزاد نہ ہو تو اس کو بعض کاموں

کا حکم دینا اور بعض کاموں سے روکنا لغو و بیہودہ شمار ہوگا۔

ب۔ بدکاروں کی مذمت اور نیک لوگوں کی ستائش میں بیان شدہ آیات انسان کے خودمختار ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ "جبر" کی صورت میں مذمت اور مدح وستائش بے معنی ہوگی۔

ج۔ جن تمام آیات میں قیامت سے متعلق سوال، اور اس دن کے فیصلے کا دن ہونے اور پھر اس کے نتیجہ میں جزا و سزا اور جنت و جہنم کا ذکر ہوا ہے، وہ انسان کے با اختیار ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ کیونکہ جبر کی صورت میں ان آیات کا کوئی مفہوم نہیں ہوگا اور سوال و جواب، روز قیامت کی عدالت میں پیشی اور بدکاروں کو سزا ملنا "ظلم محض" شمار ہوگا۔

د۔ انسان کو اس کے اعمال کا مرہون منت قرار دینے والی آیات، جیسے:

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾ (سورہ مدثر/ ۳۸)

"ہر نفس اپنے اعمال میں گرفتار ہے"

كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ﴿٢١﴾ (سورہ طور/ ۲۱)

"ہر شخص اپنے اعمال کا گروی ہے۔"

یہ آیات واضح طور پر انسان کے صاحب اختیار ہونے کو ثابت کرتی ہیں۔

اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ﴿٣﴾ (سورہ دہر/ ۳)

"یقینا ہم نے اسے راستہ کی ہدایت دیدی ہے چاہے وہ شکر گزار ہو جائے یا کفران نعمت کر نے والا ہو جائے"

مذکورہ آیت بھی ہمارے اس مدعا کو ثابت کرتی ہے

قرآن مجید میں بعض ایسی تعبیرات وارد ہوئی ہیں جو "امر بین الامرین" کے عقیدہ پر دلالت کرتی ہیں۔ لیکن بعض ناآگاہ لوگوں نے غلط فہمی سے ان آیات کو عقیدہ جبر کے حق میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً:

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ (سورہ دہر/ ۳۰)

"اور تم لوگ تو صرف وہی چاہتے ہو جو پروردگار چاہتا ہے۔"

واضح ہے کہ مذکورہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات انسان سے اختیار کو سلب کرنا نہیں چاہتی ہیں بلکہ اس حقیقت کو ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ تم تمام اختیارات اور آزادی کے باوجود خداوند متعال کے قبضہ قدرت میں ہو۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔"تفویض" سے کیا مراد ہے؟اور اس عقیدہ میں کونسا عیب ہے؟

۲۔"امر بین الامرین" کے عقیدہ کی تعلیم ہم نے ائمہ اہل بیتؑ سے حاصل کی ہے،اس مطلب کی مثال کے ساتھ وضاحت کیجئے۔

۳۔"جبر" و"اختیار" کے مسئلہ کے بارے میں قرآن مجید کی آیات کیا کہتی ہیں؟

۴۔اگر ہم جبر کے عقیدہ کو صحیح جان لیں تو پھر قیامت کے دن،جنت وجہنم اور سوال و جواب کے عقیدہ پر کیا اثر پڑے گا؟

۵۔کیا"وما تشاءون الّا ان یشاء اللّٰہ"اور اس جیسی دوسری آیات"جبر"پر دلالت کرتی ہیں؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نواں سبق: ہدایت وگمراہی خدا کے ہاتھ میں ہے

ا۔ہدایت وگمراہی کی اقسام:

ایک مسافر ایڈرس ہاتھ میں لئے ہوئے آپ کے پاس آتا ہے اورآپ سے راہنمائی کا تقاضا کرتا ہے۔آپ کے پاس اسے مقصد تک پہنچانے کے لئے دوراستے ہیں:

ایک یہ کہ اس کے ساتھ جا کر کمال نیکی اورحسن سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے منزل مقصود تک پہنچادیں اورخدا حافظ کہہ کرواپس آجائیں۔

دوسرا یہ کہ ہاتھ کے اشارہ اورمختلف نشانیوں کے ذریعہ اسے مطلوبہ جگہ کی طرف راہنمائی کریں۔

بیشک آپ نے دونوں صورتوں میں منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے اس کی راہنمائی کی ہے۔لیکن ان دونوں طریقوں میں ایک واضح فرق ہے۔دوسرا طریقہ صرف راستہ دکھانا ہے جبکہ پہلا طریقہ "مطلوبہ مقصد تک پہنچانا" ہے۔قرآن مجیداوراسلامی روایات میں "ہدایت" مذکورہ دونوں معنوں میں استعمال ہوئی ہے۔

ایک اوراعتبار سے کبھی ہدایت صرف "تشریعی" صورت کی حامل ہوتی ہے یعنی قوانین اوردستورار کے طریقہ سے واقع ہوتی ہے اورکبھی "تکوینی" صورت کی حامل ہوتی ہے،یعنی خلقت کے نظام کی راہوں سے ہدایت کی جاتی ہے،جیسے ایک مکمل انسان بننے کے لئے نطفہ کی مختلف مراحل میں ہدایت۔یہ دونوں معانی بھی قرآن مجیداورروایات میں ذکر ہوئے ہیں۔ہدایت کی اقسام واضح ہونے کے بعدہم اصل مطلب کی طرف پلٹتے ہیں۔(ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی بھی اسی طرح ہے)۔

ہم بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں کہ ہدایت اور گمراہی خدا کا کام ہے۔بیشک "راستہ دکھانے" کا تعلق خدا سے ہے،کیونکہ اس نے انبیاءکوبھیجا ہے اورآسمانی کتابیں نازل کی ہیں تاکہ انسان کی راہنمائی کریں۔

لیکن جبری طور پر "مقصد تک پہنچانا" یقیناارادہ واختیار کی آزادی کے خلاف ہے۔چونکہ خداوند متعال نے منزل مقصود تک پہنچانے کی تمام قوتیں ہمارے اختیار میں دے رکھی ہیں اورہمیں توفیق بخشنے والا وہی ہے،لہذا ہدایت کے یہ معنی بھی خداوند متعال کی طرف سے ہیں،یعنی خداوند متعال نے تمام عوامل اور مقدمات کوانسان کے اختیار میں قراردیا ہے تاکہ وہ منزل مقصود تک پہنچ جائے۔

۲۔ایک اہم سوال

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ ہم قرآن مجید کی بہت سی آیات میں پڑھتے ہیں: "خداوند متعال جسے چاہے ہدایت کرتا ہے اور جسے چاہے گمراہ کرتا ہے: جیسے یہ آیت:

فیضلّ اللّٰہ من یشاء و یھدی من یشاء وھو العزیز الحکیم※ (سورہ ابراھیم/ ۴)

"خدا جس کو چاہتا ہے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ صاحب عزت بھی ہے اور صاحب حکمت بھی۔"ا#

بعض افراد قرآن مجید کی دیگر آیات اور خود آیتوں کی ایک دوسرے کی تفسیر کو مدنظر رکھے بغیر، اس قسم کی آیات کا مشاہدہ کر کے اعتراض کی زبان کھولتے ہیں اور سوال کرتے ہیں: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ خدا جسے چاہے ہدایت کرے اور جسے چاہے گمراہ کرے؟ پس ہمارا کیا قصور ہے؟!

اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر کے وقت ہمیشہ دوسری آیات کے ساتھ ان کے رابطہ کو مدنظر رکھنا چاہئے تا کہ ہم ان کے اصلی اور حقیقی مفہوم سے آشنا ہوجائیں۔ہم یہاں پر ہدایت و گمراہی سے مربوط چند دوسری آیات کی نمونہ کے طور پر وضاحت کرتے ہیں تا کہ انھیں مذکورہ آیت کے ساتھ ملا کر آپ خود ضروری اور اصلی مطلب کو حاصل کرسکیں:

سورۂ ابراھیم کی آیت نمبر ۲۷ میں آیا ہے:

وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ

"خداوند متعال ظالمین کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے۔"

اس آیہ شریفہ کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے تو مذکورہ اشکال دور ہوجائے گا: "خدا اسے گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے جو (گمراہی) چاہتا ہے اور اسے ہدایت دیتا ہے جو "ہدایت" چاہتا ہے۔توجہ فرمائیے۔

ہم سورہ غافر کی آیت نمبر ۳۴ میں پڑھتے ہیں:

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴿۳۴﴾

"خدا زیادتی کرنے والے اور شکی مزاج انسانوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے"

سورۂ عنکبوت کی آیت نمبر ۶۹ میں ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ

"اور جن لوگوں نے ہمارے حق میں جہاد کیا ہے ہم انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے"

جیسا کہ ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ خداوند متعال کی مشیت اور اس کا ارادہ بلا وجہ نہیں ہے، نہ وہ کسی کو بلا وجہ ہدایت کی توفیق عطا کرتا ہے اور نہ کسی سے بلا وجہ سلب توفیق کرتا ہے۔

جو لوگ خدا کی راہ میں جہاد کرتے ہین، جنگ کی مشکلات کو برداشت کرتے ہیں، اپنی نفسانی خواہشات کا مقابلہ کرتے ہیں، خدا کے دشمنوں کے خلاف ثابت قدمی کا ثبوت دیتے ہیں، خداوند متعال نے انھیں ہدایت کرنے کا وعدہ دیا ہے اور یہ وعدہ عین عدالت ہے۔

لیکن جو لوگ ظلم وستم کی بنیاد ڈالتے ہیں اور لوگوں کے دلوں میں زیادتی، شک وشبہہ اور وسواس ایجاد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، خدائے متعال ان سے ہدایت کی توفیق کو چھین لیتا ہے اور ان اعمال کے نتیجہ میں ان کا دل تاریک اور سیاہ ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ سعادت کی منزل تک پہنچنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ خدا کی طرف سے گمراہ کر دینے کے معنی یہی ہیں کہ خداوند متعال ہمارے اعمال کے نتیجہ کو ہمارے اختیار میں دے دیتا ہے اور یہ بھی عین عدالت ہے (توجہ فرمائیں!)

۳۔ کیا خدا کا ازلی علم گناہ کی علت ہے؟!

آخری مطلب جو جبر واختیار کی بحث میں بیان کرنا ضروری ہے، وہ جبری عقیدہ کے قائل بعض لوگوں کا "خدا کے ازلی علم" کے عنوان سے پیش کیا جانے والا بہانہ ہے۔

وہ کہتے ہیں: کیا خداوند متعال جانتا تھا کہ فلاں شخص فلاں وقت کسی کو قتل کرنے یا شراب پینے کے جرم کا مرتکب ہوگا؟ اگر آپ کہیں خدا نہیں جانتا تھا، تو آپ خدا کے علم کا انکار کرتے ہیں، اور اگر کہیں کہ وہ جانتا تھا تو اس شخص کو وہ کام ضرور انجام دینا چاہئے ورنہ خدا کا علم واقع کے خلاف ہوگا۔

لہذا خداوند متعال کے علم کو سچ ثابت کرنے کے لئے گناہ گاروں کو مجبوراً مرتکب گناہ ہونا چاہئے اور اطاعت کرنے والوں کو مجبوراً اس کی اطاعت کرنی چاہئے۔

لیکن ایسے افراد اپنے گناہوں اور خطاؤں پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ بہانہ تراشیاں کرتے ہیں ۔حقیقت میں وہ ایک نکتہ سے غافل ہیں کہ ہم کہتے ہیں خداوند متعال ازل سے ہی جانتا تھا کہ ہم اپنے ارادہ واختیار سے اطاعت یا گناہ انجام دیتے ہیں، یعنی ہمارا اختیار وارادہ بھی خدا کے علم میں ہے۔ پس اگر مجبور ہو

جائیں تو خدا کا علم جہل میں تبدیل ہوجائے گا۔(توجہ فرمائیں)

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

فرض کیجئے ایک معلم جانتا ہے کہ فلاں شاگرد اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے فیل ہوجائے گا۔اس کا یہ علم سو فیصد صحیح ہے کیونکہ یہ اس کے کئی برسوں کے تجربوں پر مبنی ہے۔

کیا فیل ہونے کی صورت میں وہ شاگرد اپنے معلم کا گریبان پکڑ کر کہہ سکتا ہے کہ آپ کی پیشین گوئی اور علم نے مجھے فیل ہونے پر مجبور کیا؟!

اس سے بھی بہتر مثال یہ کہ فرض کریں ایک نیک اور بے خطا انسان ایک برے حادثہ کے وقوع سے پہلے اس کے بارے میں آگاہ ہوجاتا ہے اور کسی مصلحت کی بناء پر اس معاملہ میں مداخلت نہیں کرتا ہے ،کیا اس نیک اور بے گناہ انسان کا علم مجرم کی ذمہ داری کو سلب کرے گا اور اسے جرم کا مرتکب ہونے پر مجبور کرے گا؟!(دقت فرمائیں)

یا فرض کریں کہ ایک ایسی جدید مشین ایجاد ہو جو آئندہ رونما ہونے والے حادثہ کے بارے میں چند گھنٹے پہلے ہمیں خبر دے۔ہمیں یہ مشین دقیق اطلاع دیتی ہے کہ فلاں شخص اپنے مکمل اختیار و ارادہ سے فلاں وقت فلاں کام انجام دے گا۔کیا یہ پیشین گوئی کسی کے لئے جبر و زبردستی کا سبب بن سکتی ہے؟!

مختصر یہ کہ علم خدا ہرگز کسی کو کسی کام پر مجبور نہیں کرتا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ہدایت کی اقسام بیان کر کے ان کی وضاحت کیجئے۔

۲۔قرآن مجید کی آیات سے ایک ایسی آیت بیان کیجئے جس میں ہدایت و گمراہی کو خدا کی طرف نسبت دی گئی ہو۔

۳۔خدا کی ہدایت اور خدا کی گمراہی سے کیا مراد ہے؟

۴۔خداوند متعال کے "ازلی علم" سے کیا مراد ہے؟

۵۔کیا خدا کا ازلی علم ہمارے اختیار اور ذمہ داریوں کو سب کر دیتا ہے؟ اس سلسلہ میں ایک مثال کے ساتھ وضاحت کیجئے۔

دسواں سبق: عدل الٰہی اور مسئلہ "خلود"

ہم جانتے ہیں کہ قرآن مجید نے کفار اور گناہگاروں کے ایک گروہ کے بارے میں واضح طور پر دائمی سزا دینے یعنی دوسرے الفاظ میں "خلود" کا ذکر کیا ہے۔

سورۂ توبہ کی آیت نمبر ٦٨ میں آیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ

"اللہ نے منافق مردوں اور عورتوں سے اور تمام کافروں سے آتش جہنّم کا وعدہ کیا ہے جس میں یہ ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

اسی طرح اس آیت کے ذیل میں باایمان مردوں اور عورتوں کے لئے بہشت کے باغوں کا ہمیشہ کے لئے وعدہ کیا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا

(سورۂ توبہ/ ٧٢)

"اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ان باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس بات کو کیسے قبول کیا جائے کہ ایک انسان جس نے دنیا میں زیادہ سے زیادہ اسی سال یا سو سال زندگی گزاری ہو اور اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہو، اسے کروڑوں سال بلکہ ہمیشہ ہمیشہ سزا دی جائے؟!

البتہ یہ مطلب نیک اعمال کی جزا کے بارے میں زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ خدا کی رحمت کا سمندر وسیع ہے اور جزا جتنی زیادہ ہو خدا کی بے انتہا رحمت اور اس کے فضل و کرم کی علامت ہو گی۔لیکن برے اعمال اور محدود گناہوں کے نتیجہ میں ہمیشہ کے لئے اس کو کیسے عذاب میں مبتلا رکھا جا سکتا ہے۔خداوند متعال کی عدالت کے پیش نظر اس کی کیا وجہ بیان کی جا سکتی ہے؟

کیا گناہ اور اس کی سزا کے درمیان ایک قسم کا تعادل برقرار نہیں ہونا چاہئے؟

جواب:

اس بحث اور سوال کے قطعی حل اور جواب تک پہنچنے کے لئے چند نکات پر دقت کے ساتھ غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے:

الف: قیامت کے دن کی سزائیں اس دنیا کی سزاؤں سے ہرگز شباہت نہیں رکھتی ہیں۔ مثلاً اگر کوئی شخص دنیا میں کسی جرم، جیسے چوری وغیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اسے ایک خاص مدت تک جیل میں ڈال دیا جاتا ہے، لیکن قیامت کی سزائیں اکثر انسان کے اعمال کے آثار اور اس کے کاموں کی خاصیتوں کے اعتبار سے ہوتی ہیں۔

واضح تر عبارت میں گناہگاروں کی تمام سزائیں، جن کا سامنا انھیں دوسری دنیا (قیامت) میں کرنا پڑتا ہے درحقیقت ان کے اپنے کئے گئے گناہوں کا نتیجہ ہے جو ان کے دامن گیر ہوتے ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن مجید میں ایک واضح تعبیر موجود ہے، فرماتا ہے:

فَالْيَوْمَ لَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا وَّلَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴿۵۴﴾

(سورہ یٰس/ ۵۴)

”پھر آج کے دن کسی نفس پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا اور تم کو صرف ویسا ہی بدلہ دیا جائے گا، جیسے اعمال تم کر رہے تھے۔“

ایک آسان مثال سے، ہم اس حقیقت کو واضح کر سکتے ہیں:

ایک شخص منشیات یا شراب پینے کا عادی ہے، جتنا بھی اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ زہریلی چیزیں تیرے معدہ کو خراب، تیرے دل کو بیمار اور تیرے اعصاب کو مجروح کر دیں گی، وہ پروا نہیں کرتا ہے۔ چند ہفتے یا چند مہینے ان مہلک چیزوں کی خیالی لذت میں غرق رہتا ہے اور اس کے بعد بتدریج زخم معدہ، عارضہ قلب اور اعصاب کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے اور پھر دسیوں سال عمر بھر ان بیماریوں میں مبتلا ہو کر شب و روز ان کے عذاب میں گزارتا ہے۔ کیا یہاں پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس شخص نے تو چند ہفتہ یا چند مہینے سے زیادہ عرصہ منشیات یا شراب کا استعمال نہیں کیا تھا، دسیوں سال عمر بھر کیوں امراض میں مبتلا ہو گیا؟ اس کے جواب میں فوراً کہا جائے گا یہ اس کے عمل کا نتیجہ و اثر ہے! حتیٰ اگر وہ حضرت نوحؑ کی عمر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

سے بھی زیادہ یعنی دسیوں ہزار سال بھی عمر پائے اور مسلسل رنج وعذاب میں رہے تب بھی ہم یہی کہیں گے کہ اس نے جان بوجھ کراور آگاہانہ طور پراس چیز کو اپنے لئے خریدا ہے۔

قیامت کے دن کی سزائیں زیادہ تر اسی طرح ہیں، اس لئے عدالت الٰہی پر کسی قسم کا اعتراض باقی نہیں رہتا ہے۔

ب: بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ سزاؤں کی مدت گناہ کی مدت کے برابر ہونی چاہئے، یہ ایک بڑی غلط فہمی ہے، کیونکہ گناہ اور اس کی سزا کے درمیان زمانہ کے اعتبار سے کوئی ربط نہیں ہے بلکہ سزا کا تعلق اس گناہ کی کیفیت اور نتیجہ سے ہوتا ہے۔

مثلاً ممکن ہے کوئی شخص ایک لمحہ میں ایک بے گناہ انسان کو قتل کرڈالے اور اس دنیا کے بعض قوانین کے مطابق اسے عمر قید کی سزا دی جائے۔ یہاں پر ہم دیکھتے ہیں کہ گناہ انجام دینے کی مدت صرف ایک لمحہ تھی جبکہ سزا کی مدت دسیوں سال (عمر بھر) ہے، اور کوئی شخص اس سزا کو ظالمانہ شمار نہیں کرتا ہے، کیونکہ یہاں پر منٹ، گھنٹے، مہینے یا سال کی بات نہیں ہے بلکہ گناہ کی کیفیت اور نتیجہ مدنظر رکھا جاتا ہے۔

ج: جہنم میں "خلود" ہمیشگی، اور دائمی سزائیں ان لوگوں کے لئے ہیں، جنھوں نے نجات کے تمام راستے اپنے اوپر بند کر لئے ہوں اور جان بوجھ کر فساد، تباہی اور کفر ونفاق میں غرق ہوئے ہوں اور گناہوں نے ان کے سارے وجود کو اپنے لپیٹ میں لے لیا ہو کہ حقیقت میں وہ خود گناہ وکفر کا روپ اختیار کر گئے ہوں۔

قرآن مجید میں یہاں پر ایک خوبصورت تعبیر ہے:

بَلٰى مَنۡ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتۡ بِهٖ خَطِيْٓــئَتُهٗ فَاُولٰٓـئِكَ اَصۡحٰبُ النَّارِ‌ۚ هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ۝ (سورہ بقرہ/۸۱)

"یقیناً جس نے کوئی برائی حاصل کی اور اس کے گناہ نے اسے گھیر لیا، وہ لوگ اہل جہنم ہیں اور وہیں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔"

اس قسم کے افراد خداوند متعال کے ساتھ اپنے رابطہ کو مکمل طور پر منقطع کر لیتے ہیں اور نجات کے تمام راستوں کو اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔

ایسے افراد کی مثال اس پرندہ کے مانند ہے جس نے جان بوجھ کر اپنے پروں کو توڑ کر آگ لگادی ہو اور وہ مجبور ہے ہمیشہ زمین پر رہے اور آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنے سے محروم رہے۔

مذکورہ بالا تین نکات اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ دائمی عذاب کا مسئلہ جو کہ منافقین اور کفار کے ایک خاص گروہ کے لئے مخصوص ہے ہرگز "عدل الٰہی" کے خلاف نہیں ہے بلکہ یہ ان کے برے اعمال کا نتیجہ ہے اوران کو پہلے ہی اس بات سے انبیاء الٰہی کے ذریعہ آگاہ کیا جا چکا ہے کہ ان کاموں کا نتیجہ اتنا تلخ اور برا ہے۔

اگر یہ افراد جاہل ہوں اورانبیاء کی دعوت ان تک نہ پہنچی ہواور جہالت اور نادانی کی وجہ سے ایسے اعمال کے مرتکب ہوئے ہوں تو وہ یقینا اس قسم کی سزا کے مستحق نہیں ہوں گے۔

اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ قرآن مجید کی آیات اوراسلامی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی رحمت اس قدر وسیع ہے کہ گناہگاروں کے ایک بڑے گروہ کو بھی بخش دیا جائے گا:

کچھ لوگ شفاعت کے ذریعے

کچھ لوگ معافی کے ذریعے

کچھ لوگ معمولی نیک اعمال کے ذریعہ خدا کے فضل وکرم سے کثیر اجر پا کر بخش دئے جائیں گے۔

اور کچھ لوگ ایک مدت تک جہنم میں اپنے برے اعمال کی سزا بھگتنے اورالٰہی بھٹی سے گزر کر پاک و صاف ہونے کے بعد رحمت ونعمت الٰہی سے بہرہ مند ہوں گے۔

صرف ایک گروہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے باقی رہ جائے گا جو حق کے خلاف اپنی دشمنی اور ہٹ دھرمی ،ظلم وفساد اور بے حد نفاق کی وجہ سے سرتا پا کفر اور بے ایمانی کی گہری تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔جہنم کی دائمی سزا کو بعض افراد نے کیونکر عدل الٰہی کے خلاف شمار کیا ہے؟

۲۔کیا آخرت کی سزائیں اس دنیا کی سزاؤں کے مانند ہیں؟ اگر نہیں تو وہ سزائیں کیسی ہیں؟

۳۔کیا عدالت، گناہ کی مدت اور سزا کی مدت برابر ہونے کا تقاضا کرتی ہے؟

۴۔دوزخ کی دائمی سزائیں کن لوگوں کے لئے ہیں؟

۵۔عفو الٰہی سے کون لوگ بہرہ مند ہوں گے؟

نبوت کے دس سبق:

پہلا سبق: رہبران الٰہی کی ضرورت

ہمارے علم ودانش کی محدودیت

ممکن ہے بعض لوگ یہ سوچیں کہ کیا اصولی طور پر خدا کی طرف سے لوگوں کی راہنمائی کے لئے انبیاء کا مبعوث ہونا ضروری ہے؟

کیا ہماری عقل وشعور حقائق کو سمجھنے کے لئے کافی نہیں ہے؟ کیا انسان کی علمی ترقی پوشیدہ اسرار کو کشف کرنے اور تمام حقائق کو واضح کرنے کے لئے کافی اور مددگار نہیں ہے؟

جو چیزیں ممکن ہیں انبیاء ہمارے لئے لے آئیں وہ دو حالتوں سے خارج نہیں ہیں: یا ہماری عقل ان کو بخوبی درک کرتی ہے یا درک کرنے سے قاصر ہے۔

پہلی صورت میں ہم انبیاء کو تکلیف دینے کے محتاج نہیں ہیں۔ جبکہ دوسری صورت میں ہمیں عقل و خرد کے خلاف مطالب کو قبول کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

دوسرے الفاظ میں: کیا یہ درست ہے کہ انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر کسی دوسرے کے اختیار میں دے دے اور اس کی بات کو کسی چون وچرا کے بغیر قبول کرے؟ کیا انبیاء ہمارے جیسے انسان نہیں ہیں؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم اپنے آپ کو اپنے جیسے انسانوں کے اختیار میں دے دیں؟

جواب

چند نکات کی طرف توجہ کرنے سے ان تمام سوالات کے جواب اور انسان کی زندگی کے نظام میں انبیاء کا مرتبہ واضح ہو جائے گا۔

ا۔ ہمیں جاننا چاہئے کہ ہمارا علم وشعور محدود ہے۔ بشر کو نصیب ہوئی تمام علمی ترقی کے باوجود آج جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ ہمارے نہ جاننے کے مقابلہ میں ایک سمندر کے مقابلہ میں ایک قطرہ اور ایک پہاڑ کے

مقابلہ ایک تنکے کے مانند ہے۔ یا بعض بڑے دانشوروں کے کہنے کے مطابق جو بھی علوم آج ہمارے اختیار میں ہیں وہ کائنات کی کتاب ہستی کے الف با کے برابر ہیں۔

دوسرے الفاظ میں: ہمارے فیصلہ اور عقلی ادراک کا دائرہ ایک چھوٹے سے علاقہ کے مانند ہے کہ علم ودانش کی شعاعوں نے اسے روشن کیا ہے اور ہم اس کے باہر کی دنیا سے بالکل بے خبر ہیں۔

انبیاء آتے ہیں اور اس وسیع علاقہ کو ہماری ہر ضرورت کی حد تک روشن کرتے ہیں۔حقیقت میں ہماری عقل ایک قوی اور تیز روشنی والے لیمپ کے مانند ہے،لیکن انبیاء اور آسمانی وحی کی مثال تمام عالم کو روشن کرنے والے سورج کے مانند ہے۔کیا ایک قوی اور تیز روشن لیمپ رکھنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں سورج کا محتاج نہیں ہوں؟!

واضح تر عبارت میں: زندگی کے مسائل کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے: "معقول"،"غیر معقول" اور "مجہول"۔

انبیاء ہرگز نا معقول بات،یعنی عقل وخرد کے خلاف نہیں کہتے اور اگر ایسی بات کہیں تو وہ انبیاء نہیں ہیں۔وہ مجہولات کو سمجھنے اور درک کرنے میں ہماری مدد کرتے ہیں اور یہ بات ہمارے لئے بہت اہمیت رکھتی ہے۔

لہذا وہ افراد جو زمانہ ماضی میں کہتے تھے کہ عقل وخرد کے ہوتے ہوئے ہم انبیاء کے محتاج نہیں ہیں،(جیسے برہمن جو ہندوستان اور بعض دیگر علاقوں میں رہتے ہیں) یا وہ لوگ جو آج یہ کہتے ہیں کہ ان تمام علمی ترقیوں اور کامیابیوں کے بعد انسان انبیاء اور ان کی تعلیمات کا محتاج نہیں ہے،تو وہ نہ انسان کے علم ودانش کی وسعت سے باخبر ہیں اور نہ انبیاء کی رسالت کا ادراک رکھتے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال اس بچے کی ہی ہے جو پہلی جماعت میں الف با پڑھنے کے بعد کہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں اور مجھے معلم واستاد کی ضرورت نہیں ہے،کیا اس کی یہ بات بے بنیاد نہیں ہے؟

انبیاء صرف معلم ہی نہیں ہیں،ان کی رہبری کا مسئلہ ایک مستقل بحث کا حامل ہے کہ بعد میں ہم اس پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے۔

۲۔کوئی یہ نہیں کہتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو مکمل طور پر اپنے ہی جیسے کسی شخص کے اختیار میں دے دے۔اصل بات یہ ہے کہ انبیاء۔جیسا کہ ہم بعد میں ثابت کریں گے۔وحی الٰہی یعنی خداوند متعال کے لا

محدود علم سے رابطہ رکھتے ہیں اور ہمیں چاہئے کہ قطعی دلائل کے ساتھ خداوند متعال سے ان کے رابطہ کو پہچانیں ،صرف اسی صورت میں ہم انبیاء کی باتوں کو نہ صرف قبول کریں گے بلکہ ان کی تعلیمات پر دل و جان سے عمل بھی کریں گے۔

اگر میں ایک ماہر اور ہمدرد طبیعت کے نسخہ پر عمل کروں تو کیا میں نے کوئی برا کام کیا ہے؟

انبیاء ہمارے عظیم روحانی طبیب ہیں۔

اگر ہم نے اپنے معلم و استاد کے درس کو، جو ہماری عقل وفکر کے مطابق ہے، کو قبول کریں تو کیا ہم نے غلط کام کیا ہے؟ انبیاء بشریت کے سب سے بڑے معلم ہیں۔

بہتر یہ ہے کہ ہم خدا کی طرف سے انبیاء کی بعثت کی ضرورت کے دلائل پر مزید دقت کے ساتھ بحث کریں۔

ہمارے پاس تین ایسی واضح اور محکم دلیلیں موجود ہیں ،جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہم انبیاء کی راہنمائی کے محتاج ہیں:

۱۔ تعلیم کے اعتبار سے احتیاج

اگر ہم نور کی ایک خیالی اور افسانوی سواری پر سوار ہو کر تین لاکھ کیلومیٹر (پچاس ہزار فرسخ) فی سیکنڈ کی رفتار سے اس لامحدود کائنات کی سیر کریں تو کسی شک وشبہہ کے بغیر ہمیں حضرت نوحؑ کی عمر جیسی ہزاروں عمریں درکار رہوں گے تاکہ ہم اس وسیع وعریض کائنات کے صرف ایک گوشے کا نظارہ کرسکیں۔

یہ کائنات اپنی ان تمام حیرت انگیز وسعتوں کے ساتھ یقیناً عبث اور فضول نہیں بنائی گئی ہے اور جیسا کہ ہمیں توحید کے اسباق میں معلوم ہوا ہے کہ اس کائنات کا کوئی بھی فائدہ یا نفع خداوند متعال کے لئے نہیں ہے کیونکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جو ہر لحاظ سے کامل، بے نیاز ،لامحدود اور ہر نقص وعیب سے پاک ہے۔اس نے اس کائنات کو اس لئے نہیں بنایا ہے کہ اپنے کسی نقص کو برطرف کرے۔

اس لئے ہم یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ خداوند متعال کا مقصد یہ ہے کہ دوسروں پر جود و کرم کرے اور تمام موجودات کو تکامل تک پہنچا دے، جیسے سورج جو ہم زمین والوں پر چمکتا ہے حالانکہ وہ ہمارا محتاج نہیں ہے۔سورج کی یہ روشنی صرف ہمارے فائدے کے لئے ہے ورنہ ہم سورج کے لئے کون سی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

کیا ہمارے لئے رشد و تکامل کی راہ کو طے کرنے اور انسان کامل کے مرحلہ تک پہنچنے کے لئے صرف ہماری معلومات کافی ہیں؟

ہم اس کائنات کے اسرار ورموز میں سے کتنے اسرار کے بارے میں آگاہ ہیں؟ بنیادی طور پر ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کائنات کب سے وجود میں آئی ہے؟ کوئی بھی شخص ان سوالات کے صحیح اور دقیق جوابات نہیں جانتا۔ یہ کائنات کب تک باقی رہے گی؟ اس کا جواب بھی کسی کے پاس نہیں ہے۔

اجتماعی اور اقتصادی زندگی کے لحاظ سے بھی ہر دانشور اپنا ایک خاص نظریہ رکھتا ہے۔

مثلاً ایک گروہ "سرمایہ داری" نظام کا قائل ہے جبکہ دوسرا گروہ "سوشلزم" اور "کمیونزم" کے نظریات کا حامی ہے اور تیسرا گروہ نہ پہلے کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی دوسرے کو بلکہ دونوں گروہوں کے نظریات کو نقصان دہ جان کر مسترد کرتا ہے۔

اسی طرح زندگی کے دیگر مسائل میں بھی دانشوروں کے نظریات میں کافی اختلافات پائے جاتے ہیں۔

انسان حیران و پریشان ہوجاتا ہے کہ ان نظریات میں سے کس نظریہ کو قبول کرے۔؟!

انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ خلقت کے بنیادی اور حقیقی مقصد یعنی "انسان کی تمام جہات میں پرورش، بالیدگی اور تکامل" کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایسی تعلیمات کی ضرورت ہے جو صحیح اور حقیقی ہوں اور ہر قسم کی خطاؤں سے پاک اور زندگی کے حقائق کے مطابق ہوں، ایسی تعلیمات جو اس طویل راہ میں اصلی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے انسان کی مددگار ثابت ہوسکیں۔

اور یہ سب کچھ صرف علم خدا یعنی انبیاء کے ذریعہ حاصل ہونے والی الٰہی وحی سے ہی حاصل ہوسکتا ہے۔ اسی وجہ سے جس خدا نے ہمیں اس کو طے کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، ضروری ہے کہ وہ ایسا علم و دانش بھی ہمارے اختیار میں قرار دے۔

۲۔ اجتماعی اور اخلاقی مسائل میں رہبری کی احتیاج

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے وجود میں "عقل و خرد" کے علاوہ ایک اور قوت بھی موجود ہے کہ جس کا نام "غرائز اور خواہشات" ہے: خود پسندی کا غریزہ، خشم و غضب کا غریزہ، شہوت کا غریزہ اور اس قسم کے بہت

سے دیگر غرائز اور خواہشات ۔

بیشک اگر ہم اپنے غرائز کو قابو میں نہ رکھیں تو وہ ہم پر مسلط ہو جائیں گے حتی ہماری عقل وخرد کو بھی اسیر بنالیں گے اور انسان تاریخ کے ظالموں اور جابروں کی طرح ایسے بھیڑیے کی شکل اختیار کرلے گا جو ہر اعتبار سے جنگل کے بھیڑیوں سے بھی زیادہ خطرناک ہوگا۔

ہم اخلاقی تربیت کے لئے ایک تربیت کرنے والے استاد کے محتاج ہیں ،ہم ایک "نمونہ" اور "اسوہ" کے محتاج ہیں تا کہ "محاکات" کے اصول کے مطابق اس کی گفتار ورفتار پر عمل کرسکیں۔

یہ ضروری ہے کہ ہر لحاظ سے ایک کامل اور تربیت یافتہ انسان اس خطرناک اور نشیب وفراز سے پر راستے میں ہمارا ہاتھ پکڑ لے اور ہمیں غرائز وخواہشات کے طغیان سے بچائے ،اخلاقی فضائل کے اصولوں کو اپنے کردار وعمل سے ہمارے دل وجان میں نقش کردے اور ہماری روح میں شجاعت،شہامت ،انسان دوستی ،مروت،عفوو بخشش ،وفادری ،سچائی ،امانت داری اور پاک دامنی کو پروان چڑھائے۔

معصوم انبیاء کے علاوہ کون ہمارا ایسا مربی اور راہنما بن سکتا ہے؟

اسی دلیل کے پیش نظر ممکن نہیں ہے کہ ہمارا مہربان اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا خدا ہمیں ایسے راہنماؤں سے محروم رکھے۔(اس بحث کا باقی حصہ آئندہ سبق میں بیان ہوگا)

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کیا آپ یہ احساس کرتے ہیں کہ آپ کا علم ودانش جس قدر بھی زیادہ ہوجائے آپ کی جہالت آپ کے علم کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے؟ (مثال دیجئے)

۲۔کیا آپ اندھی تقلید اور انبیاء کی پیروی کے درمیان فرق کی وضاحت کر سکتے ہیں؟

۳۔اگر ہم کسی نامعلوم راستے پر راہنما کے بغیر چلیں تو ہمیں کن ممکنہ خطرے کا سامنا پڑ سکتا ہے؟

۴۔ہم انبیاء کی رہبری کے کس قدر اور کس لحاظ سے محتاج ہیں وضاحت کیجئے۔

۵۔کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اس سبق میں کونسا مطلب باقی رہا ہے جو آئندہ سبق میں بیان کیا جائے؟

دوسرا سبق

قانون گزاری کے لئے انبیاء کی ضرورت

ہم گزشتہ درس میں "تعلیم" اور" تربیت" کے حوالے سے انبیاء کی ضرورت کے بارے میں جان چکے ہیں ۔اب اجتماعی قوانین اوراس سلسلہ میں انبیا کے اہم رول پر بحث کریں گے۔

ہم جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت جواس کی ترقی کا سبب بنی ہے اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں مشہود ہے،اس کی وہی پرتلاش اجتماعی زندگی ہے۔

یقیناًاگرتمام انسان ایک دوسرے سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تو تہذیب وتمدن اورفکری لحاظ سے آج وہ سب "عصرحجر" کے انسان جیسے ہوتے!

جی ہاں! یہ انسان کی اجتماعی تلاش وکوشش ہی ہے، جس نے تہذیب وتمدن کا چراغ جلایا ہے، یہی اجتماعی تلاش وکوشش ہے جوانسان کی تمام علمی ایجادات اورانکشافات کا سبب بنی ہے۔

مثال کے طور پر اگرہم چاندتک پہنچنے کے سفر کے مسئلہ پر غور کریں،تو معلوم ہوگا کہ یہ کام صرف ایک یا چند دانشوروں اور سائنسدانوں کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ہزاروں برسوں کے دوران لاکھوں علماءاوردانشوروں کے اجتماعی مطالعات، انکشافات اورتجربیات کانتیجہ ہے کہ انسان اس عظمت تک پہنچا ہے

اگر ہمارے زمانہ میں ایک ماہرسرجن ایک مردہ انسان کے قابل استفادہ دل کونکال کر دوسرے قریب المرگ انسان کےسینہ میں پیوندلگا تاہے اوراسے قطعی موت سے نجات دلا تا ہے،تو یہ پوری تاریخ کے ہزاروں طبیبوں اورجراحوں کےتجربوں کانتیجہ ہے جواستادوں کے ذریعہ شاگردوں کومنتقل ہوتارہاہے۔

لیکن اس اجتماعی زندگی میں ان تمام فوائد کے باوجود کچھ مشکلات بھی ہیں ،اور ہ مشکلات انسانوں کے ایک دوسرے کےحقوق اورمنافع کا آپس میں متصادم ہونا ہے جوکبھی حق تلفی اور جنگ کی صورت اختیار کرلیتی ہیں۔

یہاں پرقوانین ،نظام اورقواعد وضوابط کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔قوانین ہماری تین بڑی مشکلات کوحل کرسکتے ہیں:

۱۔قانون معاشرے کی نسبت ہر فرد کے اختیارات اور ذمہ داریوں کو اور ہر فرد کی نسبت معاشرے کی ذمہ داریوں اور فرائض کو واضح کرتا ہے،اور قابلیتوں کو بالیدگی اور کوششوں کو مربوط کرنے کا سبب بنتا ہے۔

۲۔قانون لوگوں کے فریضوں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی پر ضروری نگرانی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

۳۔قانون لوگوں کو ایک دوسرے کے حقوق کو پامال کرنے سے روکتا ہے اور معاشرے کو ہرج و مرج اور مختلف افراد اور گرہوں کے درمیان تصادم سے بچاتا ہے۔ضرورت پڑنے پر زیادتی کرنے والوں کے لئے مناسب سزائیں معیّن کرتا ہے۔

بہترین قانون ساز کون ہے؟

اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ انسان کی ضرورت کے مطابق قانون سازی میں مذکورہ تین اصولوں کے ساتھ بہترین قوانین مرتب و منظم کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ تا کہ معاشرے کے افراد اور خود معاشرہ کے اختیارات،فرائض اور حقوق واضح اور معین ہو جائیں اور لوگوں کے اعمال پر مکمل نگرانی کے علاوہ ظلم وزیادتی کرنے والوں کو بھی روکا جا سکے۔

اس سلسلہ میں ہم یہاں پر ایک واضح مثال پیش کرتے ہیں:

انسانی معاشرہ کو ایک بڑی ٹرین اور حکمراں طبقہ کو اسے چلانے اور حرکت میں لانے والے انجن سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔

قانون اس ریلوے لائن کی پٹری کے مانند ہے جو اس ریل گاڑی کو منزل مقصود تک پہنچنے کے راستہ کو معین کرتی ہے۔

پہاڑوں اور درّوں کے مختلف پیچ وخم سے گزرنے والی ایک اچھی ریلوے لائن کے لئے درج ذیل خصوصیات کا ہونا ضروری ہے:

۱۔جس زمین سے ٹرین کو گزرنا ہے،اس میں اس کے زیادہ سے زیادہ دباؤ کو برداشت کرنے کی طاقت ہونی چاہئے۔

۲۔ریل کی دو پٹریوں کے درمیان کا فاصلہ مکمل طور پر ٹرین کے پہیوں کے موافق اور ہماھنگ ہونا چاہئے اور اسی طرح ٹنلوں کی دیواریں اور ان کی بلندی ٹرین کی بلندی کے مطابق ہونی چاہئے۔

۳۔نشیب وفراز اتنے گہرے اوراونچے نہ ہوں کہ ٹرین کے بریکوں اوراس کے جاذبہ کی قوت کو برداشت نہ کرسکیں۔

۴۔اسی طرح ٹرین کے گزرنے کے راستہ پر پہاڑوں سے پتھروں کے گرنے،سیلاب اور برف کے تودوں کے گرنے کومکمل طور پر مدنظر رکھنا چاہئے تا کہ ٹرین صحیح وسالم ان رستوں سے گزرکرمنزل مقصودتک پہنچ سکے۔اسی طرح اوردوسرے خصوصیات بھی اس زمین میں پائے جانے چاہئیں۔

اس مثال کو بیان کرنے کے بعد ہم پھرانسانی معاشرہ کی بحث کی طرف لوٹتے ہیں۔

انسانوں کے لئے بہتریں قانون بنانے والے قانون ساز کومندرجہ ذیل خصوصیات کا حامل ہونا چاہئے:

۱۔نوع انسان کومکمل طور پر پہچانتا ہواوران کے تمام غرائز،خواہشات،جذبات،ضروریات اور مشکلات سے آگاہ ہو۔

۲۔انسانوں میں پائی جانے والی تمام صلاحیتوں اورتوانائیوں کو مدنظر رکھےاوران کواجاگر کرنے کے لئےقوانین سے استفادہ کرے۔

۳۔معاشرے کوممکنہ طور پر پیش آنے والے ہرقسم کے حوادث اوران کے ردعمل کے بارے میں قبل ازوقت پیش گوئی کرسکے۔

۴۔معاشرہ سے اس کے کسی بھی قسم کے منافع مربوط نہ ہوں تا کہ قوانین وضع کرتے وقت اس کی فکرخوداپنے شخصی یااپنے رشتہ داروں یااپنی جماعت کے منافع کی طرف متوجہ نہ رہے۔

۵۔ضروری ہے کہ یہ قانون بنانے والامستقبل میں انسان کو حاصل ہونے والی ہرقسم کی ترقی یا تنزل سےمکمل طور پرآگاہ ہو۔

٦۔یہ قانون ساز ہرقسم کی خطا،غلطی اورفراموشی سے محفوظ ہونا چاہئے۔

۷۔یہ قانون ساز ایسی طاقت کا مالک ہونا چاہئے کہ معاشرے کےکسی فرد کی طاقت کے مقابلہ میں مرعوب نہ ہوجائے اورکسی سے نہ ڈرے اوراس کےساتھ ہی نہایت مہربان اور ہمدردہونا چاہئے۔

یہ شرائط کس میں جمع ہیں؟

کیاانسان بہترین قانون ساز ہوسکتا ہے؟

کیا آج تک کسی نے مکمل طور پر انسان کو پہچانا ہے؟ جبکہ عصر حاضر کے ایک بڑے دانشور نے انسان کے بارے میں ایک مفصل کتاب لکھی ہے اور اس کا نام"انسان،موجود ناشناختہ"(انسان ایک نا شناختہ مخلوق) رکھا ہے۔

کیاانسان کی ذہنیت،میلانات،غرائزاورجذبات کومکمل طور پر پہچان لیا گیا ہے؟

کیاانسان کی جسمانی اورروحانی ضروریات کوخداوندمتعال کےعلاوہ کوئی اورشخص جانتا ہے؟

کیاعام انسانوں میں کوئی ایساشخص پایاجاسکتا ہےجومعاشرے میں خاص ذاتی منافع نہ رکھتا ہو؟

کیا آپ عام انسانوں کے درمیان کسی ایسے شخص کو جانتے ہیں جوسہو وخطا سے محفوظ ہواور معاشرے کےتمام افرادکودرپیش مسائل سے آگاہ ہو؟

لہذا خداوندمتعال کی ذات اور خدا سے وحی حاصل کرنے والی ہستی (معصوم) کےعلاوہ کوئی بھی شخص مکمل اور بہترین قانون ساز نہیں ہوسکتا ہے،ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں: جس خداوندمتعال نے انسان کو کمال کے مراحل طے کرنے کے لئے پیدا کیا ہے،اسے چاہئے کہ اس کی ہدایت کے لئے ایسےافرادکو مامور فرمائے جوتمام الٰہی قوانین کوانسان کے اختیار میں دے دیں۔

یقیناجب لوگ جان لیں گے کہ فلاں قانون،خدا کا قانون ہےتو وہ اسے زیادہ اعتماد اور اطمینان سے قبول کر کے اس پرعمل کریں گےاوردوسرے الفاظ میں یہ آگاہی ان قوانین کے بہترین نفاذ کی ضمانت فراہم کرے گی۔

توحیدونبوت کےدرمیان رابطہ

ہم یہاں پراس مطلب پرتوجہ کرناضروری سمجھتے ہیں کہ نظام خلقت بذات خودانبیائے الٰہی اوران کی رسالت کےوجود پرایک زندہ گواہے۔

اس مطلب کی وضاحت یہ ہے:اگرہم کائنات کے حیرت انگیز نظام پرایک تحقیقی نظرڈالیں توہمیں معلوم ہوگا کہ خداوندمتعال نے اپنی مخلوقات کی کسی بھی ضرورت کواپنے لطف وکرم سےمحروم نہیں رکھا ہے۔مثلاًاگراس نےہمیں دیکھنے کے لئے آنکھیں عطا کی ہیں توان کی حفاظت اورروشنی کومناسب طور پر تنظیم کرنے کے لئے پلکیں اوربھنویں بھی عطا کی ہیں۔

آنکھوں کے گوشوں میں آنسوؤں کے غدودخلق کئے ہیں تا کہ آنکھوں کومرطوب رکھیں،کیونکہ

آنکھوں کا خشک ہونا ان کی نابودی کا سبب بن سکتا ہے۔

آنکھ کے گوشوں میں باریک سوراخ بنائے ہیں تاکہ آنکھوں کا اضافی پانی ان سوراخوں کے ذریعہ ناک میں داخل ہوجائے۔ اگر یہ باریک سوراخ نہ ہوتے تو آنسوؤں کے قطرے مسلسل ہمارے چہرے پر بہتے رہتے!

آنکھ کی پُتلی کو اس قدر حساس بنایا ہے کہ وہ خود بخود تیز یا کم روشنی کے مقابلہ میں تنگ یا گشادہ ہو جاتی ہے، تاکہ ضرورت کے مطابق آنکھ میں روشنی داخل ہوجائے اور آنکھ کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچے۔

آنکھ کے حلقہ کے اطراف میں ایسے مختلف پٹھے بنائے ہیں تاکہ سر اور بدن کو ہلائے بغیر آنکھ کو آسانی کے ساتھ ہر طرف گھما کر مختلف مناظر کو دیکھا جا سکے۔

وہ خدا جو انسان کی مختلف ضروریات کا اس قدر خیال رکھتا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ اسے ایک معصوم اور قابل اعتماد رہنما اور رہبر سے محروم رکھے جو وحی الٰہی کے ذریعہ راہنمائی کرتا ہو؟!

مشہور و معروف فلاسفر بوعلی سینا اپنے کتاب "شفا" میں یوں لکھتا ہے:

"انسان کے لئے اپنی بقا کے تحفظ اور کمال حاصل کرنے کی ضرورت کے پیش نظر انبیاء کا مبعوث ہونا یقینا پلکوں اور بھنوؤں کے بال اُگنے اور پاؤں کے تلوؤں میں خمیدگی جیسی چیزوں سے زیادہ ضروری ہے۔ ممکن نہیں ہے کہ خداوند متعال اپنی ازلی عنایت کے تقاضے کی بنا پر مذکورہ ضروری چیزوں کو پیدا کرے لیکن ان سے زیادہ ضروری چیز کو پیدا نہ کرے؟"

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ انسان کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟

۲۔ انسان قانون کے بغیر زندگی کیوں نہیں گزار سکتا ہے؟

۳۔ انسانی زندگی میں قانون کی اہمیت کو واضح کرنے کے لئے ایک زندہ مثال بیان کیجئے۔

۴۔ ایک بہترین قانون ساز کے لئے کن صفات کا ہونا ضروری ہے؟

۵۔ انبیاء کا خود انسانوں میں سے ہونا کیوں ضروری ہے؟

تیسرا سبق: انبیاء کیوں معصوم ہیں؟

گناہ وخطا سے پاک ہونا

بلا شک وشبہہ ہر نبی کے لئے ہر چیز سے پہلے تمام لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے تا کہ لوگ اس کی بات کے بارے میں جھوٹ اور غلطی کا احتمال تک نہ دیں ورنہ اس کی رہبری کا منصب متزلزل ہوجائے گا۔

اگرانبیاء معصوم نہ ہوں تو بہانہ تراشی کرنے والے اس وجہ سے کہ انبیاء غلطی کرتے ہیں اور حقیقت پسند لوگ ان کی دعوت کی باتوں میں غیر یقینی حالت کی وجہ سے ان کی دعوت کو قبول کرنے سے اجتناب کریں گے یا کم از کم اعتماد واطمینان کے ساتھ ان کی دعوت کو قبول نہیں کریں گے۔

اس دلیل کو ہم "اعتماد کی دلیل" کہہ سکتے ہیں اور یہ عصمت انبیاء کے دلائل میں سے ایک اہم دلیل ہے۔

دوسرے الفاظ میں: یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال ایک انسان کی بلاقید وشرط اطاعت کرنے کا حکم دیدے جبکہ ممکن ہے وہ انسان خطا یا گناہ کا مرتکب ہوجائے؟ کیا اس حالت میں لوگ اس کی اطاعت کر سکتے ہیں؟ اگر وہ اطاعت کریں تو ان کی اطاعت خطا وگناہ کی پیروی ہوگی اور اگر اطاعت نہ کریں تو اس کی رہبری کا منصب متزلزل ہوگا، خاص کر جبکہ انبیاء کی رہبری دوسروں کی رہبری سے مکمل طور پر متفاوت ہے، کیونکہ لوگ اپنے تمام اعتقادات اور زندگی کے اصول وقوانین میں ان ہی انبیاء سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

اسی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جب عظیم مفسرین قرآن مجید کی آیہ شریفہ:

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ (سورہ نساء/۵۹)

"اللہ کی اطاعت کرو اور رسول وصاحبان امر کی اطاعت کرو۔"

پر پہنچتے ہیں تو کہتے ہیں: کس قید وشرط کے بغیر اطاعت کرنے کا حکم اس بات کی دلیل ہے کہ نہ صرف انبیاء معصوم ہیں بلکہ "اولی الامر" بھی معصوم ہیں۔ اولوالامر سے مقصود وہ ائمہ ہیں جو پیغمبر کی طرح معصوم ہیں وگرنہ خداوند متعال بے قید وشرط ان کی اطاعت کرنے کا حکم نہیں دیتا۔

ایک دوسرا طریقہ، جس سے انبیاء کے ہر گناہ کے مقابلہ میں معصوم ہونے کو ثابت کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ "انبیاء کے وجود میں گناہ کے عوامل واسباب کامیاب نہیں ہوتے ہیں۔"

اس کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ جب ہم اپنے اندر غور کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم بھی بعض گناہوں یا برے کاموں کے مقابلہ میں تقریباً معصوم ہیں۔

درج ذیل مثالوں پر غور فرمایئے:

کیا آپ کسی ایسے عاقل انسان کو پیدا کر سکتے ہیں جو آگ کو کھالے؟ یا کوڑا کرکٹ اور کسی گندی چیز کو نگل لے؟

کیا آپ کسی باشعور کو بالکل برہنہ ہو کر گلیوں اور بازاروں میں گھومتے ہوئے پیدا کر سکتے ہیں؟

یقیناً کسی باشعور انسان کو ایسا کام کرتے ہوئے پیدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم کسی شخص کو ایسا کرتے دیکھیں تو یقین پیدا کریں گے کہ اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے اور وہ کسی نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو گیا ہے ورنہ عام طور پر محال ہے کہ کوئی عاقل شخص اس قسم کا کوئی کام انجام دے۔

جب ہم اس قسم کے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے اعمال کی برائی ہمارے لئے اس قدر واضح ہے کہ کوئی بھی عاقل انسان ان کاموں کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر ہم ایک مختصر جملہ میں اس حقیقت کو مجسم کر کے بتا سکتے ہیں کہ ہر عاقل اور صحیح وسالم شخص بعض بُرے اور ناشائستہ کاموں کی نسبت "محفوظ" یا دوسرے الفاظ میں ایک طرح "معصوم" ہوتا ہے۔

اس مرحلہ سے آگے بھی ہم بعض ایسے اشخاص کو پاتے ہیں جو کئی دوسرے برے کاموں کے مقابلہ میں بھی اپنے آپ کو محفوظ رکھتے ہیں جبکہ عام لوگوں سے ایسا ممکن نہیں ہے۔

مثال کے طور پر ایک آگاہ اور ماہر طبیب جو جراثیم کے مختلف انواع واقسام کو بخوبی جانتا ہے، ہرگز ایسے آلودہ پانی کو نہیں پیتا جس میں خطرناک متعدی بیماریوں میں مبتلا بیماروں کے کپڑے دھوئے گئے ہوں، جبکہ ممکن ہے ایک ان پڑھ اور ناآگاہ شخص اس قسم کی چیز کو اہمیت نہ دے۔

بہرحال ہم ایک سادہ تجزیہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک موضوع کے بارے میں جس قدر انسان کی آگاہی زیادہ ہو وہ برے کاموں سے زیادہ محفوظ رہ سکتا ہے۔

اس حساب سے اگر کسی کے "ایمان" اور "علم وآگاہی" کی سطح اس قدر بلند ہو جائے کہ وہ خداوند

متعال اوراس کی عدالت کے بارے میں ایسا اعتقاد ویقین پیدا کرے کہ گویا انھیں اپنی آنکھوں کے سامنے حاضر وناظر مشاہدہ کرر ہا ہے،تو ایسا انسان تمام گناہوں کے مقابلہ میں محفوظ رہے گا اوراس کے سامنے ہر برا کام ویسا ہی ہوگا ،جیسا ہماری نظروں میں کوچہ وبازار میں مادرزاد ننگا گھومنا ہے۔

اس کے لئے حرام مال بالکل آگ کے شعلہ کے مانند ہوگا ،جس طرح ہم آگ کو اپنے منہ میں نہیں ڈالتے ،وہ بھی حرام مال کو اپنے منہ کی طرف نہیں لے جاتا ہے۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ انبیاء اپنے غیر معمولی علم وآ گاہی کے پیش نظر گناہ کے عوامل پر کنٹرول رکھتے ہیں اور گناہ کے ہیجان انگیز ترین عوامل بھی ان کی عقل وایمان پر حاوی نہیں ہو سکتے ،اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ انبیاء معصوم ہیں اور ہر قسم کے گناہوں سے پاک ومنزّ ہیں۔

عصمت کا مرتبہ کیسے فضیلت کا سبب بن سکتا ہے؟

بعض افراد جو عصمت کے مفہوم اور گناہوں سے بچنے کے عوامل کے بارے میں

آ گاہی نہیں رکھتے ،اعتراض کرتے ہیں کہ اگر خداوند متعال کسی کو گناہ سے بچائے اور گناہ کے عوامل کو اس میں ختم کر دے تو یہ اس کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہوسکتی ہے! کیونکہ یہ ایک جبری عصمت ہے اور جبری عصمت فضیلت شمار نہیں ہوتی

لیکن ہماری مندرجہ بالا وضاحت کے پیش نظر اس اعتراض کا جواب مکمل طور پر واضح ہو گیا ہے:

انبیاء کی عصمت میں کسی بھی قسم کا اجباری پہلو نہیں ہے بلکہ ان میں موجود قوی ایمان ،محکم اور غیر معمولی علم وآ گاہی ان کے لئے عصمت کی ایک عظیم فضیلت حاصل ہونے کا سبب بنتے ہیں۔

اگر ایک آ گاہ و ماہر طبیب بیماری پھیلانے والے عوامل کے مقابلہ میں شدید پر ہیز کا مظاہرہ کرے تو کیا یہ اس کی مجبوری شمار کی جائے گی؟!

اگر ایسا شخص حفظان صحت کے اصولوں کی پوری طرح رعایت کرے تو کیا یہ کام اس کی ایک فضیلت شمار نہیں ہوگی؟

اگر ایک قانون دان کسی خطرناک جرم کے عدالت میں ہولناک نتائج کے پیش نظر اس سے سخت پرہیز کرتا ہے تو کیا یہ اس کی فضیلت شمار نہیں ہوگی؟

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انبیاء کے معصوم ہونے میں نہ صرف اختیاری پہلو ہے بلکہ یہ ان

کے لئے ایک بڑی فضیلت بھی ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔معصوم ہونے کی کتنی قسمیں ہیں؟

۲۔اگر انبیاء معصوم نہ ہوتے تو کیا ہوتا؟

۳۔مرتبہ "عصمت" کی حقیقت کیا ہے؟

۴۔سبق میں بیان شدہ مثالوں کے علاوہ چند اور مثالیں بیان کیجئے جن کی نسبت تمام لوگ یا کچھ لوگ معصوم ہوں۔

۵۔انبیاء کی عصمت اجباری ہے یا اختیاری؟ دلیل بیان کیجئے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

چوتھا سبق: پیغمبر شناسی کا بہترین طریقہ

بلا شک وشبہہ ہر مدعی کے دعویٰ کو قبول کرنا عقل ومنطق کے خلاف ہے۔

ممکن ہے خدا کی طرف سے پیغمبری اور رسالت کا دعویٰ کرنے والا شخص سچا ہو،لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ایک موقع پرست اور دھوکہ باز شخص سچے انبیاء کے بجائے جھوٹا دعویٰ کرے۔اس لئے ضروری ہے کہ انبیاء کی دعوت اور ان کے خدا سے رابطہ کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے ،ہمارے پاس ایک قطعی اور یقینی کسوٹی موجود ہو۔

اس مقصد تک پہنچنے کے لئے ہمارے پاس مختلف راستے موجود ہیں ،جن میں سب سے اہم مندرجہ ذیل دو راستے ہیں:

۱۔پیغمبر کی دعوت کے مطالب کے بارے میں پوری دقت سے تحقیق اور اس کے بارے میں قرائن وعلامات کو اکھٹا کرنا۔

۲۔معجزہ اور خارق العادہ کام

ہم پہلے معجزہ کے بارے میں بحث کرتے ہیں:

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لفظ"معجزہ"سن کر تعجب کا اظہار کرتے ہیں یا معجزوں کو افسانوں اور کہانیوں کے مثل جانتے ہیں،حالانکہ اگر ہم معجزہ کے معنی ومفہوم پر سنجیدگی کے ساتھ اور علمی پہلو سے غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ اس قسم کے تصورات بالکل غلط ہیں۔

حقیقت میں معجزہ ایک ناممکن کام اور بے علت معلول نہیں ہے، بلکہ سادہ الفاظ میں معجزہ ایک خارق عادت کام کو کہتے ہیں جس کو انجام دینا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں ہوتی اور یہ صرف ایک غیر معمولی طاقت کے ذریعہ ہی انجام پا سکتا ہے۔

اس لئے معجزہ کے درج ذیل شرائط ہیں:

۱۔یہ ایک ممکن اور قابل قبول کام ہے۔

۲۔عام لوگ،حتیٰ غیر معمولی ذہن رکھنے والے افراد بھی انسانی قدرت کے ذریعہ معجزہ کو انجام دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔

۳۔معجزہ پیش کرنے والے شخص کو اپنے کام پر اتنا یقین اور اطمینان ہونا چاہئے کہ دوسروں کو اس کے مقابلہ کی دعوت کرے۔

۴۔کوئی بھی شخص معجزہ کے مانند کام انجام نہیں دے سکتا ہے، جیسا کہ معجزہ کے نام ہی سے معلوم ہے کہ اس کے مقابلہ میں لوگ عاجز ہوں۔

۵۔معجزہ کا نبوت یا امامت کے دعویٰ کے ساتھ ہونا ضروری ہے (اس لئے پیغمبر اور امام کے علاوہ دوسروں سے انجام پانے والے خارق عادت کام معجزہ نہیں کہلاتے بلکہ انھیں کرامت کہا جاتا ہے)۔

چند واضح نمونے:

ہم جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں سے ایک معجزہ مردوں کو زندہ کرنا اور لا علاج مریضوں کو صحت یاب کرنا تھا۔

کیا ہمارے پاس کوئی ایسی دیل موجود ہے جس سے یہ ثابت کریں کہ انسان کے بدن کا نظام فیل ہو کر مرنے کے بعد پھر سے وہ زندہ نہیں ہو سکتا ہے؟!

کیا ہمارے پاس کوئی ایسی عقلی وعلمی دلیل موجود ہے جس سے ہم ثابت کریں کہ کینسر کی بیماری، جس کے علاج سے ہم عاجز ہیں، کا کوئی علاج نہیں ہے۔

لیکن یہ نا قابل انکار حقیقت ہے کہ انسان موجودہ قدرت اور حالات میں مردوں کو زندہ کرنے یا بعض بیماریوں کا علاج کرنے کی طاقت نہیں رکھتا ہے، چاہے دنیا کے تمام ڈاکٹر مل کر اپنے تجربات اور علم سے مدد کیوں نہ لیں۔

لیکن اس میں کیا مشکل ہے کہ ایک انسان خدا کی قدرت اور اس کے لامحدود علم کے سمندر سے آگاہی حاصل کر کے ایک پر اسرار اشارہ کے ذریعہ ایک مردہ میں پھر سے روح کو لوٹا دے یا ایک لا علاج مریض کو شفا بخش دے!

علم صرف یہ کہتا ہے کہ میں نہیں جانتا ہوں اور مجھ میں یہ کام انجام دینے کی طاق نہیں ہے، لیکن کبھی یہ نہیں کہتا ہے کہ فلاں کام انجام دینا ناممکن اور غیر معقول ہے۔

ایک دوسری مثال:

خلائی جہاز کے بغیر چاند کا سفر کرنا کسی بھی انسان کے لئے ممکن نہیں ہے، لیکن اس میں کیا حرج

ہے کہ ہماری قدرت سے برتر کوئی طاقت انسان کی ایجاد کی گئی سواری سے بالاتر ایک پر اسرار سواری کو ایجاد کر کے کسی کے اختیار میں قرار دیدے اور وہ خلائی جہاز سے مدد لئے بغیر چاند یا اس سے دور تر سیاروں کا سفر کر دے۔!

اگر کوئی شخص حقیقتاً اس قسم کا کوئی خارق عادت کام انجام دے اور اس کے ساتھ ہی نبوت کا دعویٰ بھی کرے اور لوگوں کو مقابلہ کی دعوت بھی دے اور عام لوگ اس کے مقابلہ میں عاجز ہو جائیں تو یقین کریں گے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے۔

معجزات کو توہمات اور خرافات سے نہیں ملانا چاہئے

"افراط" و "تفریط" ہمیشہ برائی اور تباہی ایجاد کرنے اور حقیقت کے چہرہ کو بگاڑنے کا سبب بنتے ہیں۔

معجزہ کے بارے میں بھی یہی امر صادق آتا ہے۔ جبکہ بعض تجدّد پسندی کے نام نہاد دعوے دار کھل کر یا اشاروں میں ہر قسم کے معجزہ سے انکار کرتے ہیں اس کے مقابلہ میں کچھ لوگ زیادہ سے زیادہ معجزے گھڑتے ہیں اور مرموز دشمنوں کے توسط سے جعل کی گئی ضعیف روایتوں اور توہمات پر مشتمل افسانوں کو معجزات کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ اس طرح انبیاء کے حقیقی معجزوں کے علمی چہرے پر افسانوں اور خرافات کے پردے ڈال دیتے ہیں۔

جب تک حقیقی معجزات اس قسم کے جعلی افسانوں سے پاک و منزّہ نہ ہو جائیں، ان کا اصلی چہرہ آشکار نہیں ہوگا۔

اسی لئے ہمارے عظیم علماء اور فقہا ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ معجزات وغیرہ کے سلسلے میں اسلامی احادیث اس قسم کے افسانوں سے آلودہ نہ ہو جائیں۔

اسی لئے "علم رجال" کو وجود میں لایا گیا تا کہ احادیث کے راویوں کو اچھی طرح پرکھا جائے اور "صحیح" اور "ضعیف" احادیث کے درمیان فرق معلوم کیا جائے اور توہمات پر مشتمل مطالب حقائق سے ملنے نہ پائیں۔

آج سامراجی اور الحادی قوتیں بیکار نہیں بیٹھی ہیں بلکہ وہ بے بنیاد باتوں کو پاک و منزہ دینی عقائد سے مخلوط کر دینے کی کوشش کرتی ہیں تا کہ اس طرح سے لوگوں کو حقیقی علم سے دور کر دیں۔ لہذا ضروری ہے کہ

ہم دشمنوں کی ان تخریبی سازشوں کے بارے میں پوری طرح باخبر رہیں اور ان کو ناکام بنادیں۔

معجزہ کا دوسری خارق عادت چیزوں سے فرق

غالباً آپ نے سنا ہوگا کہ کچھ جوگی بعض اوقات خارق عادت کام انجام دیتے ہیں، ایسے عجیب وغریب کام کا مشاہدہ کرنے والے لوگوں کی تعداد کم نہیں ہے، یہ ایک حقیقت ہے نہ افسانہ۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان خارق عادت کاموں اور انبیاء کے معجزات کے درمیان کیا فرق ہے؟ ہمارے پاس کونسی کسوٹی ہے جس پر کے ذریعہ ہم ان دو چیزوں کے درمیان فرق معلوم کرسکیں؟

اس سوال کے کئی جواب ہیں، ان میں سے واضح تر درج ذیل دو جواب ہیں:

۱۔ جوگی ہمیشہ محدود کام انجام دیتے ہیں اور دوسرے الفاظ میں کوئی بھی جوگی آمادہ نہیں ہوگا کہ آپ کی خواہش کے مطابق کسی خارق عادت کام کو انجام دے بلکہ وہ ایسا خارق عادت کام انجام دیتا ہے جسے وہ خود چاہتا ہے یعنی اسی کام کو انجام دیتا ہے جس کی اس نے مشق کر کے اچھی طرح سے سیکھا ہے اور اس پر مسلط ہوگیا ہے۔ اس بات کی وجہ واضح ہے، کیونکہ ہر انسان کی قدرت محدود ہے، وہ صرف چند ایک کاموں میں مہارت حاصل کرسکتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں انبیاء کے خارق عادت کام کی کوئی محدودیت نہیں ہے، ان کے لئے کسی قسم کی قید وشرط نہیں ہے۔ وہ ضرورت کے وقت ہر قسم کے مطالبہ شدہ معجزہ کو انجام دے سکتے ہیں، کیونکہ وہ خدا کی لا محدود قدرت سے مدد لیتے ہیں اور معلوم ہے کہ خدا کی قدرت کی کوئی حد نہیں ہے، جبکہ انسان کی قدرت نہایت محدود ہے۔

۲۔ جس کام کو ایک جوگی انجام دیدے، دوسرا جوگی بھی ویسا ہی کام انجام دے سکتا ہے یعنی وہ کام بشر کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔

اسی لئے خارق عادت کام انجام دینے والا جوگی ہرگز دوسروں کو مقابلہ کی دعوت نہیں دیتا اور دوسرے الفاظ میں وہ چیلنج نہیں کرتا ہے، کیونکہ وہ بخوبی جانتا ہے اس کے شہر یا دوسرے شہروں میں اس کے جیسے افراد موجود ہیں جو ایسا کام انجام دے سکتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس انبیاء مکمل اطمینان کے ساتھ چیلنج کرتے ہیں اور کہتے ہیں: "اگر دنیا کے تمام لوگ بھی جمع ہوجائیں تب بھی ہمارے انجام دئے گئے کام کے مانند کام کو انجام نہیں دے سکتے ہیں۔"

سحر و جادو کے بارے میں بھی یہ فرق صادق ہوتا ہے۔ مذکورہ فرقوں سے سحر اور معجزہ کے حدود بھی مکمل طور پر معلوم ہو جاتے ہیں۔ (غور کیجئے)

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ "معجزہ" کو معجزہ کیوں کہتے ہیں؟
۲۔ کیا معجزہ "قانون علّیت" سے مستثنیٰ ہے؟
۳۔ کن طریقوں سے ہم معجزہ کو جوگیوں اور جادوگروں کے کام سے الگ کر سکتے ہیں؟
۴۔ معجزہ کی اصلی شرائط کیا ہیں؟
۵۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں معجزہ جیسی کوئی چیز دیکھی ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پانچواں سبق

پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا سب سے بڑا معجزہ

لافانی معجزہ

تمام علمائے اسلام کا اس بات پر اعتقاد ہے کہ قرآن مجید، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ یہ سب سے بڑا معجزہ ہے، یہ اس لئے ہے کہ:

۱۔ قرآن مجید ایک عقلی معجزہ ہے، جس کا لوگوں کی روح اور فکر سے سروکار ہے۔

۲۔ یہ ایک ابدی، لافانی اور ہمیشہ باقی رہنے والا معجزہ ہے۔

۳۔ یہ ایک ایسا معجزہ ہے جو گزشتہ چودہ صدیوں سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے: "اگر تم لوگ یہ کہتے ہو کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئی ہے تو اس کے مانند کوئی اور کتاب پیش کرو۔"

قرآن مجید میں کئی جگہوں پر کھل کر چیلنج کی صورت میں اس قسم کے مقابلہ کی دعوت دی گئی ہے:

ایک جگہ پر قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے:

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ﴿۸۸﴾ (سورہ اسرار/ ۸۸)

"آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جنات سب اس بات پر متفق ہو جائیں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو بھی نہیں لا سکتے، چاہے سب ایک دوسرے کے مددگار اور پشت پناہ ہی کیوں نہ ہو جائیں۔"

دوسری جگہ پر اس چیلنج کی شرط کو آسان تر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۳﴾ (سورہ ہود/ ۱۳)

"کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ قرآن بندے نے گڑھ لیا ہے تو کہہ دیجئے کہ اس کے جیسے دس سورے گڑھ کر تم بھی لے آو۔ اور اللہ کے علاوہ جس کو چاہو اپنی مدد کے لئے بلا لو اگر تم اپنی بات میں سچّے ہو۔"

اس کے بعد خاص طور پر مزید فرماتا ہے کہ اگر اس دعوت کو ان لوگوں نے قبول نہیں، تو جان لینا کہ یہ آیات خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔" (سورہ ہود/ ۱۴)

ایک بار اور مقابلہ کی شرائط کو کم سے کم کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ وإن کنتم فی ریب ممّا نزّلنا علی عبدنا فاتوا بسورة من مثله وادعوا شھدائکم من دون اللّٰہ إن کنتم صدقین ※ (سورہ بقرہ/ ۲۳)

"اگر تمھیں اس کتاب کے بارے میں کوئی شک ہے جسے ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسا ایک ہی سورہ لے آو۔ اور اللہ کے علاوہ جتنے تمھارے مددگار ہیں سب کو بلا لو اگر تم اپنے دعوت اور خیال میں سچّے ہو۔"

اس کے بعد والی آیت میں واضح طور سے فرماتا ہے:

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ (سورہ بقرۃ/ ۲۴)

"اور اگر تم (کفار) ایسا نہ کر سکے اور یقینا نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جسے کافرین کے لئے مہیا کیا گا ہے۔"

قرآن مجید کے منکرین کو پے در پے اس قسم کی دعوت دینا اس بات کی دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر زیادہ بھروسہ فرماتے تھے۔ اگرچہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اور بھی متعدد معجزات نقل ہوئے ہیں، جو تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں۔

چونکہ قرآن مجید ایک زندہ معجزہ ہے اور ہم سب کی اس تک آسانی کے ساتھ رسائی ہے، اس لئے ہم معجزات کی بحث میں زیادہ تر اسی پر تکیہ کرتے ہیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اس چیلینج کے مقابلہ میں مخالفین کا عجز

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ قرآن مجید نے مقابلہ کی دعوت کے سلسلہ میں مخالفین پر زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈالا ہے، اور مختلف بھڑکانے والی عبارتوں سے ان کو دعوت دی ہے تا کہ کسی کے لئے کوئی بہانہ اور عذر باقی نہ رہے۔ جیسے:

"اگر سچ کہتے ہو" ہرگز نہیں کر سکتے"، "تمام لوگوں سے مدد لے لو کم از کم اس جیسا ایک سورہ لے آؤ" اور "اگر کافر ہو گئے تو جلا دینے والی آگ تمھارے انتظار میں ہے۔" یہ تعبیریں اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں۔

یہ سب ایک طرف، دوسری طرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے مخالفین سے کوئی آسان مقابلہ نہیں تھا، کیونکہ اسلام نے نہ صرف ان کے مذہب کو خطرہ میں ڈال دیا تھا، جس پر وہ سختی سے پابند تھے بلکہ ان کے اقتصادی اور سیاسی منافع حتی ان کے وجود کو بھی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔

دوسرے الفاظ میں اسلام کی ترقی اور نفوذ نے ان کی پوری زندگی کو درہم برہم کر کے رکھ دیا تھا۔ لہذا وہ اپنی پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کے لئے میدان میں آنے پر مجبور تھے۔

انھیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہتّا کرنے کے لئے ہر قیمت پر قرآن مجید کی جیسی چند آیتوں کو لانا چاہئے تھا تا کہ اس کے بعد قرآن ان کو چیلینج دے کر انھیں عاجز اور ناتوان نہ کر سکتا اور اپنی حقانیت کی سند پیش نہ کر سکتا۔

انہوں نے اپنے زمانہ کے فصاحت و بلاغت میں کمال رکھنے والے تمام عربوں سے مدد طلب کی، لیکن جب بھی قرآن مجید کے مقابلہ میں آئے، تو شکست سے دوچار ہوئے اور پیچھے ہٹ گئے کہ اس کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

ولید بن مغیرہ کا واقعہ

قرآن مجید سے مقابلہ کرنے کے لئے بلائے گئے لوگوں میں "ولید بن مغیرہ" بھی شامل تھا۔ اس کا تعلق قبیلۂ "بنی مخزوم" سے تھا۔ جو اس زمانہ میں عربوں کے درمیان حسن تدبیر اور فکر صائب کے لحاظ سے بڑی شہرت کا حامل تھا

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کفار نے اس سے درخواست کی کہ اس سلسلہ میں غور وخوض کر کے قرآن مجید کی عجیب وغریب آیات اوران کے غیر معمولی نفوذ کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کرے۔

"ولید نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ قرآن مجید کی چند آیات کی تلاوت فرمائیں۔پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "سورہ حم سجدہ" کی چند آیات کی تلاوت فرمائی۔

ان آیات نے ولید کے اندر ایسا اضطراب اور ہیجان پیدا کیا کہ وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور "قبلہ نبی مخزوم" کی منعقد شدہ محفل میں جا پہنچا اوران سے مخاطب ہو کر بولا:

خدا کی قسم میں نے محمد (ص) سے ایسا کلام سنا ہے کہ نہ انسان کے کلام کے مانند ہے اور نہ جن اور پریوں کے کلام کے مانند...اس کے بعد ولید بن مغیرہ نے یوں کہا:

"وان لہ لحلاوۃ وأن علیہ لطلاوۃ وأن أعلاہ لمثمر وأن اسفلہ لمغدق وانہ یعلمو ولا یعلی علیہ۔"

ان کے کلام میں ایک خاص مٹھاس اور زیبائی ہے، (ایک درخت کے مانند) اس کا اوپری حصہ میوؤں سے بھرا ہوا اور اس کی جڑ مضبوط ہے۔یہ ایک ایسا کلام ہے جو ہر چیز پر غالب ہے اور کوئی چیز اسے مغلوب نہیں کرسکتی ہے۔

ولید کے یہ کہنے سے قریش کے درمیان یہ آواز گونجنے لگی کہ ولید بن مغیرہ محمد کا دلدادہ ہوگیا ہے!

"ابوجہل" نے فوراً مغیرہ کے گھر جا کر قریش میں پھیلی ہوئی یہ بات اس کو بتائی اور اسے قریش کی مجلس میں آنے کی دعوت دی۔

ولید بن مغیرہ نے قریش کی مجلس میں آکر کہا:

"کیا تم لوگ یہ سوچتے ہو کہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیوانہ ہوگیا ہے؟ کیا تم لوگوں نے کبھی اس میں دیوانگی کے آثار دیکھے ہیں؟!

حاضرین نے کہا: "نہیں"

پھر ولید نے پوچھا:

کیا تم لوگ خیال کرتے ہو کہ وہ جھوٹ بولتا ہے؟ کیا اب تک وہ تم لوگوں میں ایک سچے اور امین شخص کی حیثیت سے مشہور نہیں تھے اور اسے تم صادق وامین نہیں کہتے تھے؟!

قریش کے بعض سرداروں نے کہا: پھر ہم اس کی طرف کون سی نسبت دیں؟

ولید نے تھوڑی دیر غور وفکر کر کے کہا: تم لوگ کہو: وہ ساحر ہے۔

اگر چہ کفار اس تعبیر سے قرآن مجید کے چاہنے والوں کو اس سے جدا کرنا چاہتے تھے۔لیکن یہ تعبیر "ساحر"خود اس بات پر ایک زندہ دلیل تھی کہ قرآن مجید غیر معمولی طور پر جذب کرنے والی پر کشش کتاب ہے، لہذا انہوں نے اس جذب کرنے والی قوت کا نام سحر رکھا، جبکہ اس کا سحر سے کوئی ربط نہیں تھا۔

اس کے بعد کفار قریش نے ہر جگہ اس کا زبردست پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ماہر جادوگر ہے اور یہ آیات اس کے جادو ہیں، اس سے دوری اختیار کریں اور اس کا کلام سننے سے پرہیز کریں۔!

لیکن تمام کوششوں کے باوجود ان کی یہ ریشہ دوانیاں کامیاب نہ ہوسکیں اور ہر گوشہ وکنار میں موجود حقیقت کے پاک دل پیاسے جوق در جوق قرآن مجید کی طرف آتے رہے اور اس الٰہی پیغام کے آب زلال سے سیراب ہوتے رہے۔اس طرح قرآن مجید کے دشمن شکشت کھا کر پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔

آج بھی قرآن مجید تمام دنیا والوں کو چیلنج کرتے ہوئے مقابلہ کی دعوت دے رہا ہے اور پکار پکار کے کہہ رہا ہے: اے ہر قوم وملت کے دانشورو، اے فلاسفہ، اے ادیبو اور اے اہل قلم! اگر تم قرآن مجید کی آیات کے بارے میں شک وشبہہ رکھتے ہو اور انھیں انسانی عقل وفکر کی اختراع سمجھتے ہو تو تم بھی اس کے مانند کلام لے آؤ!

ہم یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ اسلام کے دشمن بالخصوص عیسائی پادری (جو اسلام کو ایک انقلابی اور بامعنی دین کی حیثیت سے اپنے لئے سخت اور خطرناک رقیب جانتے ہیں) ہر سال اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرنے پر کروڑوں ڈالر خرچ کرتے ہیں اور مختلف اسلامی ممالک میں گونا گوں ثقافتی، علمی، علاج ومعالجہ اور صحت عامہ کے پروگراموں کی آڑ میں سرگرم عمل ہیں۔ان کے لئے بہت آسان ہوتا اگر وہ عربی زبان کے عیسائی دانشوروں، شاعروں، اہل قلم اور فلاسفہ کو دعوت دیتے تاکہ وہ قرآن مجید کی سورتوں کے مانند چند سورتیں لکھ کر ان کی تشہیر کر کے مسلمانوں کا منہ بند کر دیں!!

اگر ان کے لئے یہ ممکن ہوتا تو قطعاً وہ اس کام کو ہر قیمت پر انجام دینے سے گریز کرتے۔

اس موضوع کے مقابلہ میں ان کی ناتوانی قرآن مجید کے مخالفین کی بڑی شکست اور قرآن مجید کے لافانی معجزہ ہونے پر واضح اور روشن دلیل ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ کیوں قرآن مجید شمار ہوتا ہے؟

۲۔ قرآن مجید کیسا چیلینج کرتا ہے؟

۳۔ اسلام کے دشمنوں نے قرآن مجید کو کیوں سحر سے نسبت دی ہے؟

۴۔ اسلام، کیوں موجودہ عیسائیت کا سخت رقیب ہے؟

۵۔ "ولید بن مغیرہ مخزومی" کا واقعہ کیا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نبوت کے دس سبق:

چھٹا سبق: قرآن مجید کے اعجاز کی ایک جھلک

حروف مقطعات کیوں؟

قرآن مجید کی بہت سی سورتوں کے آغاز میں "حروف مقطعات" جیسے: "الم"، المر اور "یٰس" آئے ہیں۔

بعض اسلامی روایتوں کے مطابق "حروف مقطعات" کا ایک فلسفہ اور راز یہ ہے کہ خداوند متعال یہ دکھانا چاہتا ہے کہ یہ عظیم اور لافانی معجزہ قرآن مجید کیسے ان سادہ حروف "الف، با" سے وجود میں آیا ہے۔ کیسے یہ ایک عظیم کلام ایسے حروف اور الفاظ سے بنا ہے، جن کو ہر چند سالہ بچہ بھی پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، حقیقت میں اتنے عظیم کام کا ایسے کلمات والفاظ سے وجود میں آنا ہی سب سے بڑا معجزہ ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید کتنے پہلوؤں سے معجزہ ہے؟ کیا صرف فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے اور دوسرے الفاظ میں: صرف عبارتوں کی مٹھاس، مطالب کے رسا ہونے اور ان کے غیر معمولی نفوذ سے یا دوسرے پہلوؤں سے بھی معجزہ ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ جب ہم قرآن مجید پر مختلف زاویوں سے نظر ڈالتے ہیں تو ہر زاویہ اور ہر دریچہ سے اس کے اعجاز کے چہروں میں سے ایک چہرہ نظر آتا ہے، جیسے:

۱۔ فصاحت و بلاغت: اس کے الفاظ اور مفاہیم میں غیر معمولی مٹھاس اور کشش اور عجیب وغریب قوت جاذبہ پائی جاتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید ہر لحاظ سے بلند مطالب و مفاہیم پیش کرتا ہے، بالاخص ہر قسم کے خرافات سے پاک عقائد بیان کرتا ہے۔

۳۔ علمی معجزات: یعنی ایسے مسائل کے رخ سے پردہ اٹھانا جو اس زمانے تک انسان کے لئے

پوشیدہ تھے۔

۴۔مستقبل میں رونما ہونے والے بعض واقعات کے بارے میں واضح اور دقیق پیشین گوئی (قرآن مجید کی غیبی خبریں)۔

۵۔قرآن مجید میں کسی بھی قسم کے اختلاف، تضاد اور تعارض کا نہ ہونا ان کے علاوہ بھی اعجاز قرآن کے بہت سے پہلو ہیں۔

مذکورہ پانچ مسائل کے بارے میں بحث بہت طولانی ہے۔لیکن ہم چند اسباق کے ضمن میں اس بحث کے کچھ دلچسپ گوشوں کو تحقیق کے ساتھ بیان کریں گے:

فصاحت و بلاغت

ہم جانتے ہیں کہ ہر کلام کے دو پہلو ہوتے ہیں "الفاظ" اور "مفاہیم"۔

اگر کلام، کے الفاظ اور کلمات، خوشنما، شائستہ، منظم، منجسم اور ہماھنگ ہوں اور پیچیدگی سے پاک ہوں اور اس کے جملوں کی ساخت معنی و مطلب کو کامل طور پر دلچسپ اور جذاب صورت میں پیش کرے تو اس کلام کو فصیح و بلیغ کلام کہتے ہیں۔

قرآن مجید عالی ترین حد تک ان دو خصوصیات کا حامل ہے، اسی لئے آج تک کوئی شخص اس قسم کی آیات اور سورتیں نہیں لا سکا ہے جن میں ایسی کشش، جذابیت، مٹھاس اور زیبائی پائی جاتی ہو۔

ہم گزشتہ سبق میں پڑھ چکے ہیں کہ مشرکین عرب کا منتخب شخص، "ولید بن مغیرہ" قرآن مجید کی چند آیتوں کی تلاوت سن کر مضطرب اور پریشان ہو کر فکر و اندیشہ میں غرق ہو گیا، اس نے ایک مدت تک غور و فکر اور مطالعہ کے بعد قرآن مجید سے مقابلہ کرنے کے لئے قریش کے سرداروں کو حکم دیا کہ قرآن مجید کو "جادو" اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جادوگر کہیں!

کفار نے پیغمبر اسلام کو متعدد بار ساحر کی نسبت دی، اگر چہ وہ اس طرح پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی مذمت کرنا چاہتے تھے لیکن وہ حقیقت میں آپکی تعریف و تمجید کر رہے تھے، کیونکہ یہ سحر کی نسبت قرآن مجید کے غیر معمولی نفوذ کا اعتراف تھا، چونکہ عام طور پر اس کی توجیہ نہیں کی جاسکتی تھی اس لئے انھیں اسے ایک مرموز اور نامعلوم جاذبہ کی حیثیت سے قبول کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

لیکن کفار اس بات کے بجائے کہ حقیقت کو قبول کریں، قرآن مجید کو معجزہ شمار کریں اور ایمان

لائیں، اس کے خلاف ایک بات گڑھ کر گمراہ ہو گئے اور اسے جادو قرار دیا۔!

تاریخ اسلام میں ایسے واقعات بہت پائے جاتے ہیں کہ ضدّی، تند خو اور جھگڑا لو افراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جیسے ہی آتے تھے اور آنحضرت سے قرآن مجید کی آیات کی تلاوت سنتے تھے تو فوراً اپنا عقیدہ بدل دیتے تھے، کیونکہ قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کے نتیجہ میں ان کے دلوں میں اسلام کا نور چمکنے لگتا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کی کشش اور فصاحت و بلاغت یقیناً ایک معجزہ ہے۔

ماضی ہی کی بات نہیں، موجودہ زمانے میں بھی عربی ادبیات کے ماہرین جس قدر قرآن مجید کو پڑھتے ہیں اور اس کی تکرار کرتے ہیں وہ اس سے نہ صرف نہیں تھکتے اور سیر نہیں ہوتے بلکہ زیادہ سے زیادہ لذت محسوس کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی عبارتیں انتہائی دقیق اور منظم ہیں۔ یہ تعبیرات بیان کی پاکیزگی اور سنجیدگی کے علاوہ واضح اور گویا ہیں۔ ضرورت کے وقت محکم اور منہ توڑ جواب دینے والی ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید کے نازل ہونے کے زمانے میں ادبیات کے لحاظ سے عربی زبان ترقی کے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ اسی لئے عصر جاہلیت کے عربی اشعار آج بھی عربی ادبیات کے بہترین نمونے شمار ہوتے ہیں۔

مشہور ہے کہ ہر سال حجاز کے بڑے بڑے ادیب اور شاعر "بازار عکاظ" نامی ایک تجارتی اور ادبی مرکز میں جمع ہو کر اپنے بہترین اشعار کے نمونے پیش کرتے تھے۔ ان میں سے سب سے بہتر شعر کو "سال کے بہترین شعر" کے عنوان سے انتخاب کیا جاتا تھا اور اسے لکھ کر خانہ کعبہ میں لٹکا دیا جاتا تھا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظہور کے زمانے میں "معلقات سبع" کے نام سے اس قسم کے سات نمونے خانہ کعبہ میں موجود تھے۔

لیکن قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد اس کی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں یہ اشعار اس قدر پھیکے پڑ گئے کہ نہ صرف انھیں بتدریج وہاں سے ہٹا دیا گیا بلکہ انھیں فراموش بھی کر دیا گیا!

مفسرین قرآن نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق قرآن مجید کی مختلف آیتوں کے عجیب و غریب باریکیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ آپ ان تفاسیر کی طرف رجوع کر کے اس حقیقت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

قرآن مجید سے آشنائی اور معرفت حاصل ہونے پر معلوم ہوگا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مندرجہ ذیل کلام میں ذرہ برابر مبالغہ نہیں ہے:

"ظاھرہ انیق وباطنہ عمیق لاتحصی عجائب ولاتبلی غرائبہ۔"

"قرآن مجید کا ظاہر خوش آئند اور زیبا ہے اور اس کا باطن گہرا اور عمیق ہے۔ اس کے عجائب نا قابل شمار اور اس کے غرائب نا قابل زوال ہیں۔"

مکتب قرآن کے سب سے بڑے شاگرد امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام اس سلسلہ میں نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"فیه ربیع القلب وینا بیع العلم وما للقلب جلاء غیرہ"

"قرآن مجید دلوں کے لئے بہار ہے، اس سے علم ودانش کے چشمے ابلتے ہیں اور انسان کے قلب و روح کو جلا بخشنے والا صیقل اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔"

غور کیجئے وجواب دیجئے

۱۔ قرآن مجید کے "حروف مقطعات" کا فلسفہ کیا ہے؟

۲۔ کیا قرآن مجید صرف ایک اعتبار سے معجزہ ہے یا کئی اعتبار سے معجزہ ہے؟

۳۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکو مخالفین کیوں ساحر کہتے تھے؟

۴۔ فصاحت وبلاغت کے درمیان کیا فرق ہے؟

۵۔ "معلقات سبع" کس زمانے سے مربوط ہے اور اس کا مطلب کیا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ساتواں سبق

خداشناسی کے بارے میں قرآن مجید کا

طرز بیان

سب سے پہلے ہمیں اس معاشرے اور ماحول کا فکری اور ثقافتی اعتبار سے تجزیہ کرنا چاہئے، جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔

تمام مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ، اس زمانے میں سرزمین حجاز دنیا کا پسماندہ ترین خطہ تھا اور عصر جاہلیت کے لوگوں کو وحشی یا نیم وحشی اقوام کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

عقیدہ کے لحاظ سے وہ لوگ بت پرستی میں غرق تھے۔ان کی تہذیب وتمدن پر مختلف شکلوں میں پتھر اور لکڑی کے بنائے ہوئے بتوں کا منحوس سایہ وسیع پیمانے پر چھایا ہوا تھا، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کھجور کے بت بنا کر ان کے سامنے دوزانو بیٹھ کر پوجا کرتے تھے، لیکن قحط سالی کے وقت انھیں کھا جاتے تھے!

بیٹیوں سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ انھیں انتہائی بے دردی سے زندہ درگور کر دیتے تھے، اس کے باوجود فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے! اور خداوند متعال کی ذات کو انسان کی حد تک گرا دیتے تھے۔

توحید اور یکتا پرستی پر سخت تعجب کرتے تھے، جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں یکتا پرستی کی دعوت دی تو انہوں نے نہایت تعجب اور حیرانی کی حالت میں کہا:

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا ۖۚ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ﴿۵﴾ (سورہ ص/ ۵)

"کیا اس نے سارے خداؤں کو جوڑ کر ایک خدا بنا دیا ہے یہ تو انتہائی تعجب خیز بات ہے۔"

جو بھی شخص ان کی خرافات، ان کے جھوٹے افسانوں اور نظریات کے خلاف زبان کھولتا تھا، وہ اسے دیوانہ کہتے تھے۔

ان کے معاشرے پر قبائلی نظام انتہائی شدت سے حکم فرما تھا اور مختلف قبیلوں کے درمیان اختلافات کا یہ عالم تھا کہ ان کے درمیان جنگ کے شعلے کبھی خاموش نہیں ہوتے تھے، بار بار روئے زمین پر ایک دوسرے

کے خون کی ہولی کھیلتے تھے،قتل وغارت گری ان کا روزمرہ کا معمول بن گیا تھا اور اس پر فخر ومباہات کرتے تھے۔
ان کے اہم ترین مرکزی شہر، مکہ میں چند گنے چنے ہی پڑھے لکھے افراد تھے اور عالم ودانشور تو شاذونادر ہی پائے جاتے تھے۔

اسی ماحول اور معاشرے میں ایک ایسا شخص اٹھا، جس نے نہ کسی مدرسہ کا رخ کیا تھا اور نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا تھا وہ ایک ایسی کتاب لے آیا جو مفہوم ومعنی کے لحاظ سے اس قدر عظیم ہے کہ چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی صاحبان علم ودانش اس کی تفسیر میں مشغول ہیں اور ہر دور میں نئے نئے حقائق کا انکشاف کرتے ہیں۔

قرآن مجید کائنات اور اس کے نظام کے بارے میں نہایت دقیق حساب شدہ تصویر پیش کرتا ہے۔توحید کو اس کی مکمل صورت میں بیان کرتا ہے۔زمین و آسمان کی پیدائش اور شب وروز، چاند ،سورج، جمادات ونباتات اور انسان کی تخلیق کے اسرار کو خدائے وحدہ لاشریک کی نشانیوں کی دلیل کے طور پر اپنی مختلف آیات میں مختلف انداز،تعبیرات اور تشبیہات کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

کبھی وہ انسان کے وجود کی گہرائیوں میں اتر کر فطری توحید کی بات کرتا ہے:

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ ﴿٦٥﴾ (سورہ عنکبوت/ ٦٥)

"پھر جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو ایمان وعقیدہ کے پورے اخلاص کے ساتھ خدا کو پکارتے ہیں، پھر جب وہ نجات دے کر انھیں خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو فوراً شرک اختیار کر لیتے ہیں۔"

کبھی عقل وشعور کے ذریعہ استدلال کرتے ہوئے توحید کو ثابت کرتا ہے اور اس وسیع کائنات اور اپنے نفس کے بارے میں غور وفکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔زمین وآسمان، حیوانات، پہاڑوں، سمندروں ،بارش کے برسنے، بادنسیم کے جھونکوں اور انسان کے جسم وروح کے انتہائی دقیق، منظم اور پیچیدہ تخلیقی اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتا ہے۔

خداوند متعال کی صفات کو بیان کرنے کے لئے انتہائی گہرے اور دلکش طریقے کا انتخاب کرتا ہے۔ایک جگہ فرماتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۚ (سورہ شوری/١١)

"کوئی بھی چیز اس کے مانند نہیں ہے"

دوسری جگہ پر فرماتا ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ﴿۲۲﴾ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ؕ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴿۲۳﴾ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ؕ یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۚ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۲۴﴾ (سورہ حشر/ ۲۲-۲۴)

"وہ خدا وہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور وہ حاضر و غائب سب کا جاننے والا، عظیم اور دائمی رحمتوں کا مالک ہے۔ وہ اللہ وہ ہے جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ بادشاہ، پاکیزہ صفات، بے عیب، امان دینے والا، نگرانی کرنے والا، صاحب عزت، زبردست اور کبریائی کا مالک ہے۔ اللہ ان تمام باتوں سے پاک و پاکیزہ ہے جو مشرکین کیا کرتے ہیں۔ وہ ایسا خدا ہے جو پیدا کرنے والا، ایجاد کرنے والا اور صورتیں بنانے والا ہے۔ اس کے لئے بہترین نام ہیں، زمین و آسمان کا ہر ذرہ اسی کے لئے محو تسبیح ہے اور وہ صاحب عزت و حکمت ہے۔"

خداوند متعال کے علم کی توصیف اور اس علم کے لامحدود ہونے کے بارے میں حسین ترین تعبیر کے ساتھ یوں بیان کرتا ہے:

وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّ الْبَحْرُ یَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ ؕ (سورہ لقمان/ ۲۷)

"اور اگر روئے زمین کے تمام درخت قلم بن جائیں اور (سیاہی کے طور پر) سمندر کا سہارا دینے کے لئے سات سمندر اور آجائیں تو بھی کلمات الٰہی تمام ہونے والے نہیں ہیں"

خداوند متعال کے تمام چیزوں پر حاوی ہونے اور اس کے ہر جگہ حاضر و ناظر ہونے کے سلسلہ میں قرآن مجید ایسی اعلیٰ تعبیرات پیش کرتا ہے کہ وہ تعبیرات صرف قرآن مجید سے ہی مخصوص ہیں:

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ (سورہ بقرہ/ ۱۱۵)

"اور اللہ کے لئے مشرق بھی ہے اور مغرب بھی، لہٰذا تم جس جگہ کی طرف رخ کر لو گے سمجھو وہیں خدا موجود ہے"

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ (سورہ حدید/ ۴)

"اور وہ تمھارے ساتھ ہے تم جہاں بھی رہو اور وہ تمھارے اعمال کا دیکھنے والا ہے۔"

جب معاد اور قیامت کی بات کرتا ہے تو مشرکین کے تعجب اور انکار کے مقابلہ میں کہتا ہے: "(انسان اپنی خلقت کو بھول کر کہتا ہے) ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کر سکتا ہے؟"

" آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ پیدا کیا ہے وہی زندہ بھی کرے گا اور وہ ہر مخلوق کا بہتر جاننے والا ہے۔

"اس نے تمھارے لئے ہرے درخت سے آگ پیدا کر دی ہے تو تم اس سے ساری آگ روشن کرتے رہو۔ (وہ خدا جس نے آگ کے شعلوں کے ساتھ پانی کو بھی وجود بخشا ہے وہی مرنے کے بعد پھر زندہ کر سکتا ہے) کیا جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کا مثل دوبارہ پیدا کر دے؟ یقیناً ہے اور وہ بہترین پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ کہنے کا ارادہ کر لے کہ ہو جا، تو وہ شے ہو جاتی ہے۔" (سورہ یٰس/ ۷۸۔ ۸۲)

جب فوٹو گرافی اور ٹیپ ریکارڈر کا تصور بھی نہیں تھا، قرآن مجید نے انسان کے اعمال کے بارے میں اس وقت فرمایا ہے:

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ (سورہ زلزل/ ۴۔ ۵)

"اس (قیامت کے) دن وہ (زمین) اپنی خبریں بیان کرے گی کہ تمھارے پروردگار نے اسے اشارہ کیا ہے۔"

اور کبھی قرآن مجید ہاتھ، پاؤں اور بدن کی جلد کی گواہی کے بارے میں ذکر کرتا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ

(سورہ یٰس/ ۶۵)

"آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیتے ہیں اور ان کے ہاتھ ہم سے بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے۔"

وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ؕ قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ (سورہ فصلت/۲۱)

"اور وہ اپنے اعضاء سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دیدی؟ تو وہ جواب دیں گے ہمیں اسی خدا نے گویا بنایا ہے جس نے سب کو گویائی عطا کی ہے۔"

قرآن مجید کے معارف کی قدر و قیمت، اس کے مضامین ومفاہیم کی عظمت اور ان کے معارف کا خرافات سے پاک ومنزّہ ہونا اس وقت واضح ہوتا ہے جب ہم اس کا مقائسہ موجودہ تحریف شدہ توریت وانجیل سے کرتے ہیں، مثلاً ہم دیکھیں کہ آدم کی تخلیق کے بارے میں توریت کیا کہتی ہے اور قرآن مجید کیا کہتا ہے؟ انبیاء علیہم السلام کی داستانوں کو توریت کس انداز میں پیش کرتی ہے اور قرآن مجید کا انداز بیان کیا ہے؟ توریت اور انجیل خداوند متعال کی کیسے توصیف کرتی ہیں اور قرآن مجید کس طرح خدا کی توصیف کرتا ہے؟ اس صورت میں قرآن مجید اور توریت وانجیل کے درمیان فرق واضح طور پر معلوم ہو جائے گا۔

(اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے "رہبران بزرگ" نامی فارسی کتاب کا مطالعہ کریں)

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔جس معاشرہ میں قرآن مجید نازل ہوا ہے، اس کے ماحول کی خصوصیات بیان کیجئے۔

۲۔اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے والوں کے افکار پر بت پرستی نے کیا اثرات ڈالے تھے؟

۳۔فطری اور استدلالی توحید کے درمیان کیا فرق ہے؟

۴۔ پروردگار عالم کی معرفت اور اس کی صفات کے بارے میں قرآن مجید کے بیان کی روش کیسی ہے؟ مثالوں کے ساتھ واضح کیجئے۔

۵۔قرآن مجید کے مطالب ومفاہیم کو بہترین صورت میں کیسے سمجھا جا سکتا ہے؟

آٹھواں سبق

قرآن مجید اور جدید سائنسی انکشافات

بیشک قرآن مجید علوم طبیعیات یا علم طب، علم نفسیات اور علم ریاضی کی کتاب نہیں ہے۔
بلکہ قرآن مجید ہدایت اور انسان سازی کی کتاب ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں ضروری ہے وہ اس میں پایا جاتا ہے۔

ہمیں قرآن مجید سے توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ وہ ہمارے لئے مختلف علوم کا دائرۃ المعارف ہو۔ بلکہ ہمیں قرآن مجید سے نور ایمان و ہدایت ،تقویٰ و پرہیز گاری، انسانیت و اخلاق اور نظم وضبط کے قوانین کا مطالبہ کرنا چاہئے اور قرآن مجید میں یہ سب چیزیں موجود ہیں۔

لیکن قرآن مجید مذکورہ مقاصد تک پہنچنے کے لئے کبھی علوم طبیعیات کے بعض مسائل اور خلقت کے اسرار اور کائنات کے عجائبات کی طرف بھی کچھ اشارے کرتا ہے۔ بالخصوص توحید کی بحث میں "برہان نظم" کے تناسب سے خلقت کائنات کے بعض اسرار سے پردہ اٹھا کر ایسے مسائل کو واضح کرتا ہے کہ اس ماحول اور زمانہ کے دانشوروں کے لئے بھی نامعلوم تھے۔

قرآن مجید کے اس قسم کے بیانات کے مجموعہ کو ہم "قرآن مجید کے علمی معجزات" کہتے ہیں۔
یہاں پر اس قسم کے چند معجزات کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

قرآن مجید اور قوت جاذبہ کا قانون

مشہور سائنسدان "نیوٹن" سے پہلے کسی نے قوت جاذبہ کے کلی قانون کا مکمل طور پر انکشاف نہیں کیا تھا۔
کہا جاتا ہے کہ ایک دن "نیوٹن" سیب کے ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا۔ ایک سیب درخت سے جدا ہو کر زمین پر گر گیا۔ اس چھوٹے اور معمولی واقعہ نے نیوٹن کے ذہن کو اس قدر سوچ میں مبتلا کر دیا کہ وہ برسوں تک اس سلسلہ میں غور وفکر کرتا رہا کہ یہ کون سی طاقت ہے جس نے سیب کو اپنی طرف کھینچ لیا؟ کیوں یہ سیب آسمان کی طرف نہیں گیا؟ بالآخر برسوں کی فکر کے بعد اس نے قانون جاذبہ کا انکشاف کیا کہ "دو جسم

اپنے جسموں کی براہ راست نسبت سے اور ان کے درمیان فاصلہ کی مجذور معکوس نسبت سے ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔"

اس قانون کے انکشاف سے معلوم ہوا کہ نظام شمسی کہاں پر واقع ہے؟ یہ بڑے بڑے سیارے کیوں اپنے مدار میں سورج کے گرد گھومتے ہیں؟ کیوں یہ فرار کر کے مختلف اطراف کی طرف نہیں چلے جاتے؟ وہ ایک دوسرے پر کیوں نہیں گرتے؟ یہ کونسی طاقت ہے جس نے ان سیاروں کو اس لامتناہی فضا میں ایک خاص اور دقیق مدار میں گردش کی حالت میں رکھا ہے اور وہ ذرہ برابر بھی اس سے انحراف نہیں کرتے ہیں؟!

جی ہاں! "نیوٹن" نے انکشاف کیا: ایک جسم کا دائرہ کی صورت میں گھومنا اس کے مرکز سے دور ہو نے کا سبب بنتا ہے اور قانون جاذبہ اسے مرکز کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر یہ دو قوتیں (دافعہ و جاذبہ) مکمل طور پر تعادل رکھتی ہوں، یعنی "اجسام" اور ان کے درمیان "فاصلے اتنی قوت" جاذبہ" پیدا کریں کہ قوت "دافعہ" کی دورانی حرکت کی سرعت اور مرکز سے دور ہونے کا سبب بنیں تو "جاذبہ" و "دافعہ" کا یہ تعادل انھیں دائمی طور پر اپنے مدار میں رہنے پر مجبور کرتا ہے۔

لیکن قرآن مجید نے چودہ سو سال پہلے اس حقیقت کو سورۂ رعد کی دوسری آیت میں یوں بیان کیا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝۲

"اللہ ہی وہ ہے جس نے آسمانوں کو بغیر کسی ستون کے بلند کر دیا ہے، جیسا کہ تم دیکھ رہے ہو، اس کے بعد اس نے عرش پر اقتدار قائم کیا اور آفتاب و ماہتاب کو مسخر بنایا کہ سب ایک معینہ مدت تک چلتے رہیں گے، وہی تمام امور کی تدبیر کرنے والا ہے اور اپنی آیات کو مفصل طور سے بیان کرتا ہے کہ شاید تم لوگ پروردگار کی ملاقات کا یقین پیدا کرلو۔"

اسی آیت کے ذیل میں حضرت امام علی بن موسی الرضا علیہ السلام سے نقل کی گئی ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

الیس اللہ یقول بغیر عمد ترونہا؟قلت:بلی،قال:ثم عمد لکن لا ترونہا!

(امام نے فرمایا:) کیا خدا نہیں فرماتا ہے کہ ہم نے نظر نہ آنے والے ستونوں (کے ذریعہ اسے بلند کیا)؟ راوی کہتا ہے میں نے امام کے سوال کے جواب میں عرض کی: جی ہاں۔ امامؑ نے فرمایا: لہذا ستون موجود ہیں، لیکن تم انھیں نہیں دیکھ پاتے ہو۔"

کیا "قوت جاذبہ" کے مفہوم سے عام لوگوں کو آگاہ کرنے کے لئے عربی زبان میں "عمدٍ لا ترونھا"(غیر مرئی ستون) سے زیادہ واضح اور آسان تعبیر موجود ہے؟!

ایک اور حدیث میں امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"ھذا النجّوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض مربوطة کل مدینة الی عمود من نور"

"آسمان پر موجود یہ ستارے، زمین پر موجود شہروں کے مانند شہر ہیں۔ ہر شہر دوسرے شہر کے ساتھ (ہر ستارہ دوسرے ستارے کے ساتھ) نور کے ستون کے ذریعہ جڑا ہوا ہے"!

آج کے سائنسدان اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ آسمان پر موجود ستاروں میں کروڑوں کی تعداد میں ایسے ستارے ہیں جن میں زندہ اور عقل وشعور رکھنے والی مخلوقات ساکن ہیں اگر چہ ان کی تفصیلات اور جزئیات ابھی تک انسان کی دسترس میں نہیں ہیں۔

زمین کے اپنے اور سورج کے گرد گھومنے کا انکشاف

مشہور ہے کہ جس شخص نے سب سے پہلے اس بات کا انکشاف کیا کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے، وہ تقریباً چار سو سال پہلے اٹلی میں رہنے والا، "گلیلیو" نام کا ایک ماہر فلکیات تھا۔ سو سال اس انکشاف سے پہلے دنیا کے دانشور اور ماہر فلکیات، ایک مصری دانشمند "بطلیموس" کے نظریہ ہیئت پر عمل پیرا تھے کہ وہ کہتا تھا: زمین کائنات کا مرکز ہے اور تمام دوسرے سیارے (کرّات) اس کے گرد گھومتے ہیں۔"

البتہ "گلیلیو" کو اس علمی انکشافات کے جرم میں کلیسا کے حامیوں کی طرف سے حکم کفر دیا گیا۔ اس نے اپنے اس نظریہ کے بارے میں بظاہر توبہ اور اظہار ندامت کر کے موت سے نجات پائی۔ لیکن آخر کار اس

کے بعد والے دانشوروں اور سائنسدانوں نے اس کے نظریہ پر تحقیق جاری رکھی اور آج یہ مسئلہ نہ صرف ایک مسلم علمی حقیقت کے عنوان سے قبول کیا جا چکا ہے، بلکہ قابل حس تجربوں سے بھی ثابت ہو چکا ہے کہ زمین اپنے گرد گھومتی ہے۔ فضائی پروازوں کے بعد یہ مسئلہ عینی مشاہدات کے مرحلہ سے بھی گزر چکا ہے۔

مختصر یہ کہ زمین کی مرکزیت کا مسئلہ غلط ثابت ہوا اور معلوم ہو گیا کہ یہ ہماری آنکھوں کا دھوکہ ہے کہ ہم زمین کو ساکن اور تمام ستاروں اور سیاروں کو زمین کے گرد گھومتے محسوس کر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم خود حرکت میں ہیں اور ستاروں اور سیاروں کو حرکت میں فرض کرتے ہیں۔

بہر حال "بطلیموس" کا نظریہ تقریباً پندرہ سو سال تک علماء اور دانشوروں کے ذہنوں پر چھایا رہا، حتیٰ قرآن مجید کے ظہور کے وقت بھی کوئی اس نظریہ کی مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

لیکن جب ہم قرآن مجید کی آیات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ نمل کی آیت نمبر ۸۸ میں زمین کی گردش پر واضح صورت میں روشنی ڈالی گئی ہے:

وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ؕ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ ؕ اِنَّهٗ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۸۸﴾ (سورۂ نمل/۸۸)

"اور تم پہاڑوں کو دیکھو گے تو سمجھو گے کہ جیسے وہ اپنی جگہ پر جامد ہیں حالانکہ یہ بادلوں کی طرح چل رہے ہوں گے۔ یہ اس خدا کی صنعت ہے جس نے ہر چیز کو محکم بنایا ہے اور وہ تمھارے تمام اعمال سے باخبر ہے۔"

مذکورہ آیت واضح الفاظ میں پہاڑوں کی حرکت کا ذکر کرتی ہے جبکہ ہم سب انھیں ساکن تصور کرتے ہیں۔ اور ان کی حرکت کی بادلوں کی حرکت سے تشبیہ دینا اس کی سرعت، نرمی اور سکوت اور بغیر شور وغل کے ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ "زمین کی حرکت" کو پہاڑوں کی حرکت سے تعبیر کر کے اس حقیقت کی عظمت کو آشکار کیا جا رہا ہے، کیونکہ یہ مسلم ہے کہ پہاڑ اپنے اطراف کی زمینوں کی حرکت کے بغیر کوئی حرکت نہیں رکھتے بلکہ دراصل ان کی حرکت زمین کی حرکت ہے (اپنے گرد گھومنا یا سورج کے گرد گھومنا یا دونوں حرکتیں)۔

ذرا غور کیجئے: ایک ایسے زمانے میں جب دنیا کی تمام علمی محافل اور دانشور زمین کے ساکن

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

وثابت ہونے اور سورج اور تمام سیاروں اور ستاروں کے حرکت میں ہونے کے نظریہ کو باضابطہ طور پر قبول کر چکے تھے، یہ اعلان کرنا کہ زمین حرکت میں ہے، کیا یہ ایک عظیم علمی معجزہ شمار نہیں کیا جائے گا؟!

اور یہ اعلان بھی ایک ایسے شخص کے توسط سے کہ جس نے نہ صرف کسی سے کوئی سبق نہیں پڑھا تھا بلکہ ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزار رہا تھا جو علم وتہذیب سے دور شمار ہوتا تھا، کیا یہ انکشاف اس آسمانی کتاب کی حقانیت کی دلیل نہیں ہے۔؟

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔قرآن مجید کے علمی معجزات سے کیا مراد ہے؟

۲۔"قانون جاذبہ" کا سب سے پہلے کس نے انکشاف کیا ہے اور وہ کس زمانہ میں زندگی بسر کرتا تھا؟

۳۔قرآن مجید کس آیت میں اور کس تعبیر سے "قانون جاذبہ" کو بیان کرتا ہے؟

۴۔"زمین کے سکون کا نظریہ" کس نے پیش کیا ہے اور یہ نظریہ کتنے سال تک دنیا والوں کے افکار پر چھایا رہا؟

۵۔قرآن مجید نے کس آیت میں اور کس تعبیر سے "زمین کی حرکت" کو بیان کیا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نواں سبق

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حقّانیت پر ایک اور دلیل

نبوت کا دعویٰ کرنے والے کسی شخص کی دعوت کی حقانیت معلوم کرنے یا اس کے جھوٹ کا سراغ لگانے کے لئے معجزہ کے مطالبہ کے علاوہ دوسرا ایک طریقہ بھی ہے اور یہ طریقہ مقصد تک پہنچنے کی ایک اور زندہ دلیل ہوسکتا ہے۔ اور وہ طریقہ درج ذیل قرائن کی تحقیق وجمع آوری سے حاصل ہوسکتا ہے:

۱۔ اخلاقی خصوصیات اور اجتماعی ریکارڈ۔

۲۔ دعوت کے ماحول پر چھائے ہوئے حالات۔

۳۔ زمانہ کے حالات۔

۴۔ دعوت کے مطالب۔

۵۔ نفاذ واجراء کے اصول وضوابط اور مقصد تک پہنچنے کے وسائل۔

۶۔ معاشرے پر دعوت کے اثرات کا اندازہ۔

۷۔ مقصد کے بارے میں داعی کے ایمان وفداکاری کا اندازہ۔

۸۔ انحرافی تجویزوں اور مشوروں کی موافقت نہ کرنا۔

۹۔ عمومی افکار پر تیزی سے اثر انداز ہونا۔

۱۰۔ ایمان لانے والے لوگوں کے بارے میں تحقیق کرنا کہ وہ کس قسم کے طبقات سے تعلق رکھتے ہیں؟!

حقیقت میں اگر ہم ہر مدعی کے بارے میں مذکورہ دس مسائل پر سنجیدگی سے غور وفکر اور بحث وتحقیق کریں تو ہم اس کے سچ اور جھوٹ کو آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان شدہ مطالب کے پیش نظر ہم مذکورہ دس مسائل کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے سے ایک مختصر تحقیق وتجزیہ پیش کریں گے اگر چہ ان کے بارے میں متعدد کتابیں تالیف کرنے کی ضرورت ہے۔

۱۔دوست اور دشمن کی لکھی گئی تاریخوں سے جو کچھ ہمیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجتماعی سرگرمیوں کے دوران آپ کی اخلاقی خصوصیات کے بارے میں معلوم ہوتا ہے،وہ یہ ہے کہ آپ اس قدر پاک وپاکیزہ اور ایماندار تھے کہ حتی جاہلیت کے زمانے میں بھی آپ کو"امین" کا لقب دیا گیا تھا۔تاریخ کہتی ہے:مدینہ کی طرف ہجرت کرتے وقت آپ نے حضرت علی علیہ السلام کو مامور فرمایا تھا کہ آپ کے مدینہ روانہ ہونے کے بعد لوگوں کی امانتوں کو ان تک پہنچادیں۔

آپ کی شجاعت،استقامت،حسن اخلاق،وسعت قلبی،جوانمردی اور عفو وبخشش جیسی خصوصیات کا مشاہدہ جنگ وصلح کی حالت میں کیا جاسکتا ہے بالخصوص فتح مکہ کے موقع پر آپ کی طرف سے شکست خوردہ خونخوار دشمنوں کے حق میں عام معافی کا اعلان ان خصوصیات کی ایک زندہ مثال ہے۔

۲۔سب جانتے ہیں کہ عام لوگ،حتی غیر معمولی ذہانت کے مالک لوگ بھی،خواہ نخواہ ماحول کے حالات سے متاثر ہوتے ہیں،البتہ بعض لوگ زیادہ اور بعض کم تر۔

اب ذرا غور کیجئے کہ جس شخص نے اپنی زندگی کے چالیس سال جہل و بت پرستی کے ماحول میں گزارے ہوں،ایک ایسے معاشرے میں زندگی گزاری ہو کہ جس کے لوگوں کی تہذیب وتمدن کے تانے بانے شرک وخرافات کی بنیاد پر مستحکم ہوئے ہوں،اس کے لئے کیسے ممکن ہے کہ وہ فقط توحید کا دم بھرتے ہوئے شرک کے تمام مظاہر سے مقابلہ کرے؟!

یہ کیسے ممکن ہے کہ جہالت کے ماحول سے علم کے اعلیٰ ترین جلوے نمودار ہوجائیں؟!

کیا یہ قابل یقین ہے کہ ایک "ماورائے طبیعت" تائید الٰہی کے بغیر ایسا عجیب مظہر وجود میں آئے؟!

۳۔ہمیں دیکھنا چاہئے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور کس زمانے میں ہوا ہے؟ایک ایسے زمانے میں کہ دنیا قرون وسطیٰ کے دور سے گزر رہی تھی،وہ مطلق العنانیت،استبداد،امتیازی سلوک اور قومی وطبقاتی ظلم کا دور تھا۔بہتر ہے ہم اس سلسلہ میں حضرت علی علیہ السلام کی زبان سے سنیں،جو ظہور اسلام سے پہلے اور بعد والے دور کے عینی شاہد تھے،آپؑ فرماتے ہیں:

"خداوند متعال نے آپ کو ایک ایسے زمانے میں رسالت پر مبعوث فرمایا،جب دنیا کے لوگ حیرت کی وادی میں گمراہ ودربدر تھے،ان کی عقلیں جان لیوا ہوا وہوس کی تابع تھیں۔غرور وتکبر نے انھیں زوال سے دوچار کردیا تھا۔جاہلیت کی تاریکیوں نے انھیں گمراہ کردیا تھا اور وہ جہل واضطراب کی حالت میں

سرگرداں و پریشان تھے۔" (نہج البلاغہ، خطبہ نمبر ۹۱)

اب ذرا غور کیجئے کہ جس دن کا لائحہ عمل انسانوں کی مساوات، قومی اور طبقاتی تعصّبات کو ختم کرنا اور "انّما المومنون اخوة" (مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں) ہو، وہ دین اس زمانے کے حالات سے کیا مطابقت رکھتا ہے؟

۴۔ آپ کی دعوت کا موضوع، تمام جہات میں توحید، تمام ظالمانہ امتیازات کو ختم کرنا، عالم انسانیت کا اتحاد، ظلم وستم سے مقابلہ کرنا، ایک عالم گیر (عادلانہ) حکومت کا منصوبہ، مستضعفین کا دفاع اور انسانی اقدار کے اہم ترین معیار کے طور پر تقویٰ، پرہیزگاری، پاکیزگی اور امانت داری کا پرچار تھا۔

۵۔ آپ نے اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے میں کسی صورت میں بھی اس نامعقول نظریہ پر عمل نہیں کیا کہ "مقصد وسیلہ کی توجیہ کرتا ہے"۔ کہ آپ اپنے مقدس مقاصد تک پہنچنے کے لئے مقدس وسائل سے استفادہ کرتے تھے۔

آپ دوٹوک الفاظ میں فرماتے تھے:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ط (سورہ مائدہ/۸)

"اور خبردار کسی قوم کی عداوت تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ انصاف ترک کردو"

میدان جنگ میں اخلاقی اصولوں کی رعایت کرنے، غیر فوجیوں (عام انسانوں) کو اذیت و تکلیف نہ دینے، درختوں اور نخلستانوں کو نابود نہ کرنے، دشمن کے لئے پینے کے پانی کو آلودہ نہ کرنے، جنگی قیدیوں سے محبت سے پیش آنے اور اس قسم کے دسیوں مسائل کے بارے میں آپ کے احکام اس حقیقت کے واضح ثبوت ہیں۔

۶۔ اس معاشرے میں آپ کی دعوت کے اثرات کا یہ عالم تھا کہ اسلام کے دشمن، لوگوں کے آپ کے قریب آنے سے گھبراتے تھے، کیونکہ وہ آپ میں غیر معمولی قوت جاذبہ اور آپکے کلام میں نفوذ کا اثر دیکھتے تھے۔ بعض اوقات آپ کی گفتگو کے دوران شوروغل برپا کرتے تھے تاکہ لوگ آپ کے کلام کو سن کر آپ کے گرویدہ نہ ہوجائیں، اسی لئے آپ کے معجز نما اثر و رسوخ پر پردہ ڈالنے کے لئے آپ کو "ساحر" اور آپ کے کلام کو "سحر" سے تعبیر کرتے تھے کہ یہ بذات خود آپ کی دعوت کے غیر معمولی اور عجیب اثر کا اعتراف تھا۔

۷۔ اپنی دعوت کی راہ میں آپ کی جاں نثاری کے پیش نظر معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنے لائے ہوئے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دین کے بارے میں دوسروں سے زیادہ مؤمن و پابند تھے۔

بعض جنگوں کے میدانوں میں، جہاں تازہ اسلام لائے ہوئے افراد بھاگ گئے لیکن آپ انتہائی سختی سے دشمن کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔اور جہاں پر دشمن لالچ اور دھمکی، مختصر یہ کہ ہر راہ سے سامنے آتا تھا آپ ان تمام مسائل کی پروا کئے بغیر اپنے عقیدہ پر سختی سے ثابت قدم رہتے تھے اور کمزوری اور شک وشبہہ سے دوچار ہوکر ہرگز آپ کے قدم نہیں ڈگمگاتے تھے۔

۸۔کئی بار کوشش کی گئی کہ آپ کو منحرفین کی سازش کے جال میں پھنسایا جائے، لیکن آپ کبھی نہ پھنسے، آپ فرماتے تھے: "اگر سورج کو میرے ایک ہاتھ میں اور چاند کو دوسرے ہاتھ میں دیدیا جائے (یعنی پورے نظام شمس کو میرے قبضہ میں دے دیا جائے تاکہ میں اپنے مقصد سے دست بردار ہوجاؤں) تو بھی میں اپنے مقصد سے دست بردار نہیں ہوں گا۔"

۹۔آپ کی دعوت کا عام لوگوں کے افکار پر اثر نہ صرف عجیب تھا بلکہ اس کی سرعت بھی معجزنما تھی۔ جن لوگوں نے اسلام کے بارے میں مغربی مستشرقین کی لکھی گئی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان تمام مستشرقین نے اسلام کے تیزی کے ساتھ پھیلنے پر تعجب کیا ہے مثال کے طور پر "تاریخ تمدن عرب اورمشرق میں اس کی بنیادیں" نام کی کتاب لکھنے والے مشہورترین مغربی مصنفین اس حقیقت کا صریحی طور سے اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اس بات کو جاننے کے لئے اسلام کیسے اس قدر تیزی سے ترقی کر کے ایک صدی سے بھی کم عرصہ میں اس زمانہ کی متمدن دنیا کے اکثر علاقوں پر چھا گیا؟ اب تک کی گئی تمام کوششوں کے باوجود بھی یہ راز ایک لاینحل معمے کی صورت میں باقی ہے۔"

جی ہاں حقیقت میں یہ ایک معما ہے کہ اس زمانہ کے وسائل کے ساتھ اسلام کس طرح اتنی تیزی اور سرعت کے ساتھ کروڑوں انسانوں کے دلوں کی گہرائیوں میں نفوذ کر گیا اور بہت سی تہذیبوں اور ثقافتوں کو ختم کر کے ایک نئی تہذیب وتمدن کو وجود میں لایا؟

۱۰۔آخر میں ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ آپ کے دشمن کفرواستکبار کے سردار، ظالم اور خودخواہ سرمایہ دار تھے، جبکہ آپ پر ایمان لانے والے اکثر پاک دل جوان حق کے متلاشی، محروم، مظلوم اور حتی غلام تھے۔ یہ ایسے افراد تھے جن کا سرمایہ سچائی اور پاک دلی کے علاوہ کچھ نہیں تھا اور وہ حق کے پیاسے تھے۔

ان بحثوں کے مجموعہ سے کہ جس کی شرح بہت تفصیلی ہے،ہم آسانی کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچتے ، ہیں کہ آپ کی دعوت ایک الٰہی دعوت تھی ، ایک ایسی دعوت تھی جس کا سر چشمہ ماورائے طبیعت تھا، یعنی ایک ایسی دعوت جس کو پروردگار عالم نے انسانوں کو برائی ،تباہی ، جہالت ،شرک ،ظلم اور ستم سے نجات دلانے کے لئے بھیجا تھا۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔کیا پیغمبر اسلام کی حقانیت کی پہچان کے لئے معجزہ کے علاوہ بھی کوئی طریقہ موجود ہے؟ وہ کون سا طریقہ ہے؟

۲۔" قرائن کی جمع آوری" سے کس قسم کے قرائن مراد ہیں؟ اور کن امور کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت ہے؟

۳۔کیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد عرب معاشرے کے درمیان موازنہ کرنے سے کوئی نتیجہ اخذ کیا سکتا ہے؟

۴۔عصر جاہلیت میں دنیا بالخصوص عربوں کے بارے میں اگر کچھ جانتے ہیں تو اس کا ایک خلاصہ بیان کیجئے۔

۵۔اسلام کے دشمنوں نے (صلی اللہ علیہ والہ والسلم) پر کیوں سحر کی تہمت لگائی ؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دسواں سبق: (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا خاتم الانبیاء ہونا

خاتمیت کا صحیح مفہوم

(محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) خداوند متعال کے آخری نبی ہیں اور نبوت کا سلسلہ آپ پر ختم ہوتا ہے۔ یہ "دین اسلام کی ضروریات" میں سے ہے۔

"ضروری" کا معنی و مفہوم یہ ہے کہ جو بھی شخص مسلمانوں کی صفوں میں داخل ہوجائے، جلدی ہی سمجھ لے گا کہ تمام مسلمان اس مطلب کا عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک واضح اور مسلّم ہے۔ یعنی جس طرح کوئی شخص مسلمانوں سے سروکار رکھتا ہو، تو وہ جانتا ہے کہ مسلمان مذہبی لحاظ ہے "توحید" کی اصل پر سختی سے قائل ہیں، اسی طرح وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تمام مسلمان (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آخری نبی ہونے کے عقیدہ پر اتفاق رکھتے ہیں اور مسلمانوں کا کوئی گروہ کسی نئے نبی کے آنے کا منتظر نہیں ہے۔

حقیقت میں انبیاء کی بعثت کے ساتھ قافلہ بشریت نے اپنے تکامل کے مختلف مراحل کو یکے بعد دیگرے طے کیا ہے اور بالآخر انسان رشد و تکامل ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہے، جہاں پر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوسکتا ہے۔ یعنی "اسلام کی جامع تعلیمات" سے استفادہ کرکے اپنی مشکلات کو حل کرسکتا ہے۔

دوسرے الفاظ میں، اسلام کمال بشریت کے دور کا آخری اور جامع قانون ہے۔ عقائد کے لحاظ سے دینی بصیرت کا مکمل نمونہ اور عمل کے حوالے سے بھی ایسا منظم قانون ہے جو ہر زمان و مکان میں انسان کی تمام ضروریات کے مطابق ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کی دلیل

اس دعوی کو ثابت کرنے کے لئے دلائل ہمارے پاس کئی موجود ہیں کہ ان میں سے واضح تر درج ذیل تین دلیلیں ہیں:

ا۔ اس مسئلہ کا ضروری ہونا: ہم نے کہا کہ جو بھی شخص دنیا کے مسلمانوں سے جہاں کہیں بھی رابطہ قائم کرے، اسے معلوم ہوگا کہ وہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاتم الانبیاء ہونے کے قائل ہیں۔ اس لئے اگر کوئی شخص اسلام کو دلیل و منطق کی بنیاد پر قبول کرے، تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے آخری نبی ہونے کے عقیدہ کو بھی قبول کرے، کیونکہ ہم نے گزشتہ اسباق میں اس دین کی حقانیت کو بہت

سی دلیلوں کے ذریعہ ثابت کیا ہے، لہٰذ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاتم الانبیاء ہونے کے عقیدہ کو بھی قبول کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ اس دین کی ضروریات میں سے ہے۔

۲۔ قرآن مجید کی آیات بھی (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خاتم الانبیاء ہونے پر واضح اور روشن دلیل ہیں، جیسے سورہ احزاب کی آیت نمبر ۴۰ میں ارشاد ہوا ہے:

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ

"محمد تمھارے مردوں میں سے کسی ایک کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور سلسلہ انبیاء کے خاتم ہیں"

قرآن مجید نے یہ تعبیر اس وقت پیش کی ہے جب عربوں میں منہ بولا بیٹا بنانے کا رواج تھا۔ وہ کسی دوسرے ماں باپ کے بچے کو اپنے بیٹے کے طور پر لے لیتے تھے اور وہ ایک حقیقی فرزند کے عنوان سے اس خاندان میں داخل ہوتا تھا، محرم ہوتا تھا اور وارث بن جاتا تھا۔

لیکن اسلام نے اس جاہلانہ رسم کو ختم کرتے ہوئے فرمایا: "لے پالک بچے ہرگز حقیقی فرزندوں کی طرح شرعی اور حقوقی قوانین مین شریک نہیں ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے ایک "زید" بھی تھے جن کی پرورش آنحضرتؐ نے فرمائی تھی، وہ بھی آپ کے فرزند کہے جاتے تھے۔ لہٰذا قرآن مجید فرماتا ہے: بجائے اس کے کہ تم لوگ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ان لوگوں مین سے کسی کے باپ کے عنوان سے پکارو آنحضرت کو دو اصلی اور حقیقی اوصاف یعنی "رسالت" و "خاتمیت" کے عنوان سے پکارو۔

اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا آپکی رسالت کے مانند سبوں کے لئے واضح، ثابت اور مسلّم تھا۔

صرف یہ سوال باقی ہے کہ "خاتم" کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

"خاتم" "ختم" سے بنا ہے۔ اس کا معنی ختم کرنے والا اور وہ چیز ہے جس کے ذریعہ کسی کام کو ختم کیا جائے۔ مثلاً ہر خط کے اختتام پر لگائی جانے والی مہر کو "ختم" کہتے ہیں۔ انگوٹھی کو بھی اس لئے "ختم" کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں انگوٹھی کا نگینہ کو مہر کی جگہ پر استعمال کیا جاتا تھا، ہر ایک اپنے خط کے آخر پر اپنی انگوٹھی کے نگینہ سے مہر لگاتا تھا، جس پر اس کا نام یا کوئی اور نقش کندہ ہوتا تھا، ہر ایک کی انگوٹھی کا نقش اس شخص سے مخصوص ہوا کرتا تھا۔

اسلامی روایات میں مذکور ہے: جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس زمانہ کے کسی بادشاہ یا حکمراں کو اسلام کی دعوت دینے کے لئے خط لکھنا چاہتے تھے، تو آپ کی خدمت میں عرض کی گئی کہ عجم کے بادشاہ مہر کے بغیر خط کو قبول نہیں کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت تک بالکل سادہ اور مہر کے بغیر خط تحریر فرماتے تھے۔ اس تجویز کے بعد آپ نے حکم فرمایا کہ آپ کے لئے ایک ایسی انگوٹھی بنائی جائے جس کے نگینہ پر کلمہ "لا الہ الا اللّٰہ محمدٌ رسول اللّٰہ" نقش ہو۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے تمام خطوط پر یہ مہر لگائی جاتی تھی۔

اس لئے "خاتم" کا اصلی معنی ختم کرنے والا آخر تک پہنچانے والا ہے۔

۳۔ بہت سی ایسی روایتیں بھی پائی جاتی ہیں جن سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاتم الانبیاء ہونا واضح طور پر ثابت ہوتا ہے۔ ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں:

الف: جابر بن عبداللہ انصاری سے نقل کی گئی ایک معتبر حدیث میں آیا ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انبیاء کے درمیان میری مثال ایسی ہے جیسے کسی نے ایک خوبصورت عمارت تعمیر کی ہو، لیکن اس عمارت میں ایک جگہ صرف ایک اینٹ لگانا باقی ہو، جو بھی اس عمارت میں داخل ہوتا ہے، اس خالی جگہ پر نظر ڈالتے ہی کہتا ہے: کتنی خوبصورت ہے یہ عمارت لیکن ایک اینٹ کی جگہ خالی ہے۔ میں وہی آخری اینٹ ہوں اور نبوت کا سلسلہ مجھ پر ختم ہو گیا ہے۔" (تفسیر مجمع البیان)

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حلال محمد حلال ابداً الیٰ یوم القیامة وحرامه حرام ابداً الیٰ یوم القیامة۔"

"حلال محمد ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک حلال ہے اور حرام محمد ہمیشہ ہمیشہ قیامت تک حرام ہے" (اصول کافی، ج۱، ص۵۸)

شیعہ اور سنّی راویوں سے نقل کی گئی ایک مشہور حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"انت منیّ بمنزلة هارون من موسیٰ الاّ انه لا نبیّ بعدی۔"

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

" آپ کی میرے ساتھ وہی نسبت ہے، جو ہارون کی حضرت موسیٰ سے تھی، صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔"

اس قسم کی دسیوں احادیث موجود ہیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاتم الانبیاء ہونے کے سلسلہ میں کچھ سوالات ایسے ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے:

پہلا سوال:

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر انبیاء کی بعثت خدا کی طرف سے ایک بڑا فیض ہے، تو ہمارے زمانے کے لوگ کیوں اس عظیم فیض و برکت سے محروم ہیں؟ اسی زمانہ کے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کیوں ایک نئے راہنما کو نہیں بھیجا جاتا؟

جواب: ایسا کہنے والے حقیقت میں ایک اہم نکتہ سے غافل ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں کسی نبی کے مبعوث نہ ہونے کا سبب اس زمانہ کے لوگوں کا بے لیاقت اور نا اہل ہونا نہیں ہے، بلکہ اس لئے ہے کہ قافلہ بشریت علم و فکر کے لحاظ سے ایک ایسی منزل تک پہنچ گیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے استفادہ کر کے خود آگے بڑھ سکتا ہے۔

اس بات کی مزید وضاحت کے لئے ہم یہاں پر ایک مثال پیش کرتے ہیں: اولوالعزم نبی، یعنی صاحب شریعت اور صاحب کتاب نبی، پانچ ہیں: " حضرت نوحؑ، حضرت ابراھیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ، اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ علیہم السلام"۔ ان میں سے ہر ایک نے ایک خاص زمانے میں لوگوں کی ہدایت اور ان کے رشد و تکامل کے لئے انتھک کوششیں کی ہیں اور قافلہ بشریت کو ایک مرحلہ سے گزار کر دوسرے مرحلہ میں ایک دوسرے اولوالعزم پیغمبر کے حوالے کیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ قافلہ اپنی آخری منزل تک پہنچ کر اس قابل ہو گیا کہ خود اپنے راستے پر آگے بڑھ سکے۔ اس کی مثال اس طالب علم کی ہے جو اپنی تعلیم کے مختلف پانچ مراحل طے کر کے فارغ التحصیل ہوتا ہے: (البتہ فارغ التحصیل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ اس سے مراد اپنے پیروں پر کھڑے ہو کر سفر کو جاری رکھنا ہے)

تعلیم کے یہ پانچ مراحل حسب ذیل ہیں:

پرائمری، مڈل، ہائر سیکنڈری، گریجویشن (بی اے اور ایم اے) اور ڈاکٹریٹ۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اگر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کیا ہوا ایک شخص سکول یا یونیورسٹی نہیں جا تا ہے،تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس میں صلاحیت نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ وہ اس قدر علم وآ گاہی رکھتا ہے کہ جس کی مدد سے وہ اپنی علمی مشکلات کوحل کرسکتا ہےاوراپنے مطالعات کو جاری رکھتے ہوئے ترقی کے مراحل طے کرسکتا ہے۔

دوسرا سوال:

چونکہ انسانی معاشرہ ہمیشہ تغیر وتبدّل کی حالت میں ہوتا ہے،اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کے مستقل،ثابت اور یکساں قوانین معاشرے کی ضروریات کاحل پیش کرسکیں؟

جواب:اسلام میں دوقسم کے قوانین ہیں: پہلی قسم ان قوانین پر مشتمل ہے جو انسان کی خاص صفات کے مانند مستقل اور ثابت ہیں،جیسے:توحید پر اعتقاد،عدالت کے اصول کا نفاذ،اور ہر قسم کے ظلم و زیادتی سے مقابلہ کرناوغیرہ۔

ان قوانین کی دوسری قسم کلی اور جامع اصولوں کے ایک سلسلہ پر مشتمل ہے جو موضوعات میں تبدیلی پیدا ہونے سے نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ہر زمانے کی تغیر پذیر ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔

مثلاً اسلام میں"اوفو ابالعقود" کے عنوان سے ایک کلی قاعدہ ہے۔(یعنی اپنے عہد و پیمان کی وفاداری کرتے ہوئے انھیں پورا کرو)

زمانہ کے گزرنے کے ساتھ یقیناً نئے اور مفید تجارتی،سیاسی اوراجتماعی معاہدات ومعاملات پیش آتے ہیں۔انسان مذکورہ کلی قوانین کو مدنظر رکھتے ہوئے جدید مسائل کا جواب دے سکتا ہے۔

اسی طرح ایک دوسرا قائدہ بنام" قائدہ لاضرر" ہے۔اس قائدہ کے مطابق جو بھی حکم اور قانون انسان یا معاشرہ کے لئے مضر ہو اسے محدود ہونا چاہئے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اسلام کے یہ کلی قاعدے کس قدر مسائل کوحل کرنے میں کارساز ہیں۔اسلام میں اس قسم کے قاعدے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ہم انہی کلی قواعد اور اصول سے استفادہ کر کے عظیم اسلامی انقلاب کے بعد(بلکہ ہمیشہ)پیچیدہ ترین مسائل اور مشکلات کوحل کرسکتے ہیں۔

تیسرا سوال:

بیشک ہمیں اسلامی معاشرے میں مختلف مسائل کے سلسلہ میں رہبر کی ضرورت ہے۔پیغمبر کی عدم

موجودگی اوران کے جانشین کی غیبت کے پیش نظر رہبری کا مسئلہ معطّل ہوکررہ گیا ہے،اور خاتمیت کے اصول کے پیش نظر کسی دوسرے نبی کے مبعوث ہونے کی امید بھی نہیں کی جاسکتی ہے،کیا یہ امر اسلامی معاشرہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے؟

جواب:اس زمانہ کے لئے بھی اسلام میں ضروری راہ حل کو مدنظر رکھا گیا ہے،یعنی "ولایت فقیہ" کے ذریعہ اسلامی معاشرے کی رہبری کی ذمہ داری جامع الشرائط اوراعلیٰ سطح پر علم وتقویٰ اور سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے ایک فقیہ کے ذمہ رکھی گئی ہے۔ایسے رہبر کی پہچان کا طریقہ بھی اسلامی قوانین میں واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے،لہذا اس سلسلہ میں بھی کسی قسم کی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔

اس بنا پر "ولایت فقیہ" سلسلہ انبیاء واوصیاء ہی کی ایک کڑی ہے۔"جامع الشرائط فقیہ کی رہبری "اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ سرپرست اوررہبر سے محروم نہیں ہے۔

(اس سلسلہ میں مزید تفصیلات کے لئے مصنف کی فارسی کتاب "طرح حکومت اسلامی" کا مطالعہ فرمائیں)۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔خاتمیت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟

۲۔قرآن مجید کی آیات سے خاتمیت کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟

۳۔ہمارے زمانہ کے لوگ انبیائے الٰہی کی بعثت سے کیوں محروم ہوں؟

۴۔اسلامی قوانین کی کتنی قسمیں ہیں یہ قوانین ہمارے زمانہ کے مسائل کو کیسے حل کرسکتے ہیں؟

۵۔کیا اسلامی معاشرہ رہبر کے بغیر قائم رہ سکتا ہے؟ ہمارے زمانہ میں رہبری کا مسئلہ کیسے حل کیا جاسکتا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

امامت کے دس سبق

پہلا سبق: امامت کی بحث کب سے شروع ہوئی؟

ہم جانتے ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد مسلمان دو گرہوں میں تقسیم ہو گئے:

ایک گروہ کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا ہے، اور یہ کام امت پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ مل بیٹھ کر اپنے درمیان میں سے کسی ایک کو رہبر کے عنوان سے منتخب کریں ۔اس گروہ کو" اہل سنت" کہتے ہیں۔

دوسرا گروہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین آپ کے ہی مانند خطا و گناہ سے معصوم ہونا چاہئے اور بے پناہ علم کا حامل ہونا چاہئے تاکہ لوگوں کی معنوی و مادی رہبری کی ذمہ داری سنبھال سکے اور اسلام کے اصولوں کی حفاظت کرتے ہوئے انھیں بقا بخشے۔

ان کا عقیدہ ہے کہ ان شرائط کے حامل جانشین کا انتخاب خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ہی ممکن ہے، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلی وسلم نے یہ کام انجام دیا ہے اور حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا ہے۔اس گروہ کو" امامیہ" یا" شیعہ" کہتے ہیں۔

ان مختصر مباحث سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں عقلی، تاریخی اور قرآن وسنت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دلائل کی روشنی میں بحث وتحقیق کریں۔لیکن اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ہم چند نکات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

کیا یہ بحث اختلاف پیدا کرنے والی ہے؟

جب امامت کی بحث چھڑتی ہے تو بعض لوگ فوراً یہ کہتے ہیں کہ آج کل ان باتوں کا زمانہ نہیں ہے!

آج مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی کا زمانہ ہے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

جانشین کا مسئلہ پر گفتگو کرنا اختلاف وافتراق پیدا ہونے کا سبب بن سکتا ہے!

آج ہمیں اپنے مشترک دشمنوں کے بارے میں سوچنا چاہئے ،جیسے:صہیونزم اور مشرق و مغرب کی استعماری طاقتیں ۔اس لئے ہمیں اس اختلافی مسئلہ کو پس پشت ڈالنا چاہئے ۔لیکن یہ طرز فکر یقینا غلط ہے، کیونکہ:

ا۔ جو چیز اختلاف وافتراق کا سبب بن سکتی ہے، وہ تعصب پر مبنی غیر معقول بحث اور کینہ پرور جھگڑے ہیں ۔لیکن مخلصانہ اور دوستانہ ماحول میں،تعصب ،ہٹ دھرمی اور لڑائی جھگڑوں سے پاک عقلی واستدلال بحثیں نہ صرف اختلاف انگیز نہیں ہیں، بلکہ باہمی فاصلوں کو کم اور مشترک نقطہ نظر کو تقویت بخشتی ہیں

میں نے اپنے حج وزیارت کے سفروں کے دوران متعدد بار حجاز کے اہل سنت علماء اور دانشوروں سے اس سلسلہ میں بحثیں کی ہیں ۔ہم دونوں فریق محسوس کرتے تھے کہ یہ بحثیں نہ صرف ہمارے تعلقات پر بُرا اثر نہیں ڈالتی تھیں بلکہ زیادہ سے زیادہ آپسی افہام وتفہیم اور خوش فہمی کا سبب بھی بنتی تھیں ۔ یہ بحثیں ہمارے آپسی فاصلوں کو کم کرتی ہیں اور اگر کوئی بغض وعناد ہوتو اسے دلوں سے پاک کردیتی ہیں ۔

اہم بات یہ ہے کہ ان بحثوں کے دوران واضح ہوجاتا ہے کہ ہمارے درمیان مشترک نقطہ نظر کثرت سے پائے جاتے ہیں کہ ہم ان مشترک نظریات پر اعتماد اور بھروسہ کرکے اپنے مشترک دشمن کا مقابلہ کرسکتے ہیں ۔

خود اہل سنت بھی چار مذاہب میں تقسیم ہوئے ہیں (حنفی ،حنبلی ،شافعی اور مالکی)ان چار مذاہب کا وجود ان میں اختلاف کا سبب نہیں بنا ہے اگر وہ شیعہ فقہ کو کم از کم پانچویں فقہی مذہب کے عنوان سے قبول کریں گے تو بہت سے اختلافات اور مشکلات دور ہوجائیں گے ،جیسا کہ ماضی قریب میں اہل سنت کے عظیم مفتی اور مصر کی الازہر یونیورسٹی کے سربراہ "شیخ شلتوت" نے اہل سنت کے درمیان فقہ شیعہ کا باضابط طور پر اعلان کرکے ایک بڑا اور مؤثر قدم اٹھایا۔انہوں نے اس طرح اسلامی افہام وتفہیم کے حق میں ایک بڑی اور مؤثر خدمت کی جس کے نتیجہ میں شیخ شلتوت اور عالم تشیع کے مرجع عالیقدر آیت اللہ العظمی مرحوم بروجردی کے درمیان دوستانہ تعلقات برقرار ہوئے ۔

۲۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ دوسرے مذاہب سے زیادہ شیعہ مذہب میں اسلام کی تجلّی واضح صورت میں موجود ہے ۔ہم تمام مذاہب کا احترام کرتے ہوئے عقیدہ رکھتے ہیں کہ مذہب شیعہ اسلام کو تمام جہات

میں بہتر صورت میں پہنچنو اسکتا ہے اور اسلامی حکومت سے متعلق مسائل کو حل کرسکتا ہے۔

تو پھر کیوں نہ ہم اپنے بچوں کو دلیل و منطق کے ساتھ اس مکتب کی تعلیم دیں؟! اور اگر ایسا نہ کیا تو یقیناً ہم ان کے ساتھ خیانت کریں گے۔

ہمیں یقین ہے کہ پیغمبر اسلام نے قطعاً اپنے جانشین کو معین فرمایا ہے، اس میں کیا مشکل ہے کہ عقل و منطق اور دلیل و برہان سے اس موضوع پر بحث کریں؟

لیکن ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اس بحث کے دوران دوسروں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کریں۔

۳۔ اسلام کے دشمنوں نے، مسلمانوں کے اتحاد و اتفاق کی بنیادوں کو متزلزل کرنے کے لئے سنیوں میں شیعوں کے خلاف اور شیعوں میں سنیوں کے خلاف اس قدر جھوٹ اور تہمتیں پھیلائی ہیں کہ جس کے نتیجہ میں بعض ممالک میں تمام شیعہ اور سنی ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔

جب ہم امامت کے مسئلہ کو مذکورہ ذکر شدہ طریقے سے بیان کریں گے اور شیعوں کے نقطہ نظر کو قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں دلائل سے واضح کریں گے، تو معلوم ہوگا کہ یہ جھوٹا پروپیگنڈا تھا اور ہمارے مشترک دشمنوں نے زہر چھڑکا ہے۔

مثال کے طور پر میں یہ کبھی بھول نہیں سکتا کہ ایک سفر کے دوران عربستان کی ایک عظیم دینی شخصیت سے میری ملاقات اور بحث ہوئی۔ اس نے اظہار کیا: "میں نے سنا ہے کہ شیعوں کا قرآن ہمارے قرآن سے الگ ہے۔"

میں نے انتہائی تعجب کے ساتھ اس سے کہا: میرے بھائی اس بات کی تحقیق کرنا بہت آسان ہے۔

میں آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ خود یا آپ کا نمائندہ میرے ساتھ آئے تاکہ "عمرہ" کے بعد کسی پیشگی اطلاع کے بغیر ایران چلیں وہاں کے تمام کوچہ و بازار میں مسجدیں ہیں اور ہر مسجد میں بڑی تعداد میں قرآن مجید موجود ہیں۔ اس کے علاوہ تمام مسلمانوں کے گھروں میں بھی قرآن مجید موجود ہیں۔ آپ جس مسجد میں چاہیں گے ہم چلیں گے یا جس گھر میں چاہیں اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے اور ان سے قرآن مجید طلب کریں گے تاکہ معلوم ہو جائے کہ آپ کے اور ہمارے قرآن میں ایک لفظ حتیٰ کہ ایک نقطہ کا بھی

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اختلاف نہیں ہے ۔(بہت سے قرآن مجید ،جن سے ہم استفادہ کرتے ہیں خود عربستان ،مصر اور دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک سے شائع ہوئے ہیں)

بیشک اس دوستانہ اور نہایت استدلالی بحث کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسلام کے دشمنوں نے اس مشہور عالم دین کے ذہن میں جو عجیب زہر افشانی کر رکھی تھی ،اس کا اثر ختم ہو گیا۔

مقصود یہ ہے کہ امامت سے مربوط بحثیں ،جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا، اسلامی معاشرے میں اتحاد و اتفاق کو مستحکم کرتی ہیں اور حقائق کے واضح ہونے اور فاصلے کم ہونے میں مدد کرتی ہیں ۔

امامت کیا ہے؟

جیسا کہ عنوان سے ہی واضح ہے کہ "امام" مسلمانوں کے پیشوا اور قائد کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور شیعوں کے اصول عقائد کے اعتبار سے "امام معصوم" اسے کہا جاتا ہے جو ہر چیز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین ہو،اس فرق کے ساتھ کہ پیغمبر مذہب کا بانی ہوتا ہے اور امام مذہب کا محافظ و نگہبان ہوتا ہے ۔پیغمبر پر وحی نازل ہوتی ہے لیکن امام پر وحی نازل نہیں ہوتی ہے۔امام پیغمبر سے تعلیمات حاصل کرتا ہے اور قدرت کی طرف سے غیر معمولی علم کا حامل ہوتا ہے۔

شیعہ عقیدہ کے مطابق "امام معصوم" حکومت اسلامی کا صرف رہبر ہی نہیں ہوتا ہے، بلکہ وہ معنوی و مادی، ظاہری و باطنی ،غرض ہر جہت سے اسلامی معاشرے کا رہبر اور قائد ہوتا ہے، وہ اسلامی عقائد و احکام کا نگہبان اور محافظ ہوتا ہے اور ہر قسم کے خطا و انحراف سے محفوظ ہوتا ہے اور وہ خدا کا منتخب بندہ ہوتا ہے۔

لیکن اہل سنت ،امامت کی اس طرح تفسیر نہیں کرتے ہیں ، بلکہ وہ اسے صرف اسلامی معاشرہ کا سربراہ جانتے ہیں ،اور دوسرے الفاظ میں وہ ہر عصر و زمانہ کے حکمرانوں کو پیغمبر کا خلیفہ اور مسلمانوں کا امام جانتے ہیں ۔

البتہ ہم آئندہ بحثوں میں ثابت کریں گے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک الٰہی نمایندہ کا ہونا ضروری ہے یعنی پیغمبر یا ایک معصوم امام روئے زمین پر ضرور موجود ہونا چاہئے تا کہ دین حق کی حفاظت اور طالبان حق کی رہبری کرے۔اور اگر کبھی یہ امام معصوم کسی مصلحت کے پیش نظر لوگوں کی نظروں سے غائب ہو جائے تو اس کی طرف سے اس کے نمائندے احکام الٰہی کی تبلیغ اور حکومت اسلامی کی تشکیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ جولوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل امامت کی بحث کرنا مناسب نہیں ہے ان کی دلیل کیا ہے۔

۲۔ اس دلیل کے مقابلے میں اس بحث کی ضرورت کے لئے ہمارے پاس کتنے مستدل جواب ہیں؟

۳۔ اسلام کے دشمن مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو کیسے پھیلاتے ہیں اور ان اختلافات کو دور کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

۴۔ کیا آپ دشمنوں کی تفرقہ اندازی کے کچھ نمونے پیش کر سکتے ہیں؟

۵۔ شیعہ مکتب میں "امامت" کے کیا معنی ہیں اور اس کا سنی مکتب میں "امامت" کے معنی سے کیا فرق ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

دوسرا سبق: امام کے وجود کا فلسفہ

بعثت انبیاء کی ضرورت کے موضوع پر جو بحث ہم نے کی اس سے کافی حد تک ہمارے لئے پیغمبر کے بعد امام کی ضرورت کا مسئلہ واضح ہو جاتا ہے، کیونکہ نبیا ور امامؑ اکثر موضوعات میں مشترک ہیں، لیکن یہاں پر ضروری ہے کہ کچھ دوسرے موضوعات پر بھی روشنی ڈال جائے:

الٰہی رہبروں کے وجود کے ساتھ معنوی تکامل

سب سے پہلے ہمیں انسان کی خلقت کے مقصد پر بحث کرنی چاہئے کیونکہ یہ گلدستہ کائنات کا سب سے اچھا پھول ہے۔

انسان خدا کی طرف، تمام جہات میں کمال مطلق اور معنوی تکامل کی منزل تک پہنچنے کے لئے ایک طولانی اورنشیب وفراز سے پرراستہ طے کرتا ہے۔

بیشک انسان اس راستہ کو ایک معصوم پیشوا کی رہبری کے بغیر طے نہیں کرسکتا ہے اوراس کے لئے ایک الٰہی معلم کی رہبری کے بغیر یہ منزل طے کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ "اس راہ میں تاریکیاں اور گمراہی کے خطرات موجود ہیں"۔

یہ صحیح ہے کہ خداوند متعال نے انسان کو عقل وشعور کی قوت سے نوازا ہے اوراسے محکم اور قوی ضمیر عطا کیا ہے،اس کے لئے آسمانی کتابیں بھیجی ہیں۔لیکن ممکن ہے یہ انسان ان تمام تکوینی اورتشریعی وسائل کے باوجود اپنے لئے صحیح راہ کی شناخت کرنے میں غلطی کا شکار ہو جائے۔ بیشک ایک معصوم پیشوا انحراف اور گمراہی کےخطرات کو دور کر دیتا ہے۔لہذا "امام کا وجود انسان کی تخلیق کے مقصد کو مکمل کرنے والا ہے۔"

یہ وہی چیز ہے جسے عقائد کی کتابوں میں "قاعدہ لطف" سے تعبیر کیا گیا ہے۔اور "قاعدہ لطف" سے مراد یہ ہے کہ خداوند متعال ان تمام چیزوں کو انسان کے اختیار میں دیتا ہے جو اس کو تخلیق کے مقصد تک پہنچنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔انبیاء کی بعثت اور امام معصوم کا وجود بھی ان ہی میں سے ہے ورنہ انسان کے مقصد خلقت کی مخالفت لازم آئے گی۔(غور فرمائیں)۔

آسمانی ادیان کی حفاظت

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ جب الٰہی ادیان انبیاء کے قلوب پر نازل ہوتے ہیں تو وہ بارش کے پانی کی بوندوں کے مانند صاف وشفاف حیات بخش اور روح پرور ہوتے ہیں۔لیکن جب وہ آلودہ ماحول اور کمزور یا ناپاک ذہنوں میں وارد ہوتے ہیں تو رفتہ رفتہ آلودہ ہوجاتے ہیں اور خرافات وتوہمات ان میں اس قدر مخلوط ہوجاتے ہیں کہ ان کی بنیادی پاکیزگی اور لطافت ختم ہوجاتی ہے۔اس حالت میں نہ ان میں جذّابیت باقی رہتی ہے اور نہ تربیت کا خاص اثر،نہ ہی یہ ادیان پیاسوں کو سیراب کر سکتے ہیں اور نہ ان میں فضائل وکمالات کی کلیاں اور پھول کھلا سکتے ہیں۔

اس لئے ضروری ہے کہ دین ومذہب کی اصلی شکل کی حفاظت اور دینی اصول وضوابط کے خالص رہنے کے لئے ایک معصوم پیشوا موجود ہوتا کہ وہ انحرافات،غلط افکار،غلط اور اجنبی نظریات،توہمات وخرافات سے دین کو بچا سکے۔اگر دین ومذہب ایسے رہبر سے محروم ہوگا تو وہ دین مختصر مدت کے اندر ہی اپنی حقیقی شکل اور پاکیزگی کو کھودے گا۔

اسی لئے حضرت علی علیہ السلام نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں:

"اللّٰهم بلی،لا تخلوا لارض من قائم لله بحجة،اما ظاهراً مشهوراً،اوخائفاً مغموراً لئلا تبطل حجج الله وبیناته۔"

(نہج البلاغہ،کلمات قصار نمبر ۱۴۷)

"جی ہاں،زمین ہرگز قیام کرنے والے حجت خدا سے خالی نہیں ہوسکتی ہے،خواہ (وہ حجت خدا) ظاہر وآشکار ہو یا مخفی وپوشیدہ،تاکہ خدا کی واضح دلیلیں اور نشانیاں باطل نہ ہونے پائیں۔"

حقیقت میں قلب امام اس محفوظ صندوق کے مانند ہے جس میں ہمیشہ گراں قیمت اسناد رکھے جاتے ہیں تاکہ چوروں کی لوٹ مار اور دوسرے حوادث سے محفوظ رہیں یہ بھی وجود امام کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ ہے۔

امت کی سیاسی واجتماعی رہبری

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ کوئی بھی معاشرہ یا گروہ ایک ایسے اجتماعی نظام کے بغیر باقی نہیں رہ سکتا ہے جس کی سرپرستی ایک توانا رہبر کرتا ہو۔اسی لئے زمانہ قدیم سے آج تک تمام اقوام وملل نے اپنے لئے ایک رہبر کو منتخب کیا ہے۔کبھی یہ رہبر صالح ہوتا تھا لیکن بہت سے مواقع پر نا صالح ہوتا تھا۔اکثر مواقع پر امتوں کی ایک رہبر کی ضرورت اور احتیاج سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ظالم بادشاہ اور سلاطین زور وزبر دستی سے لوگوں پر مسلط ہو کر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے یہ ایک طرف۔

دوسری طرف انسان کو اپنے معنوی کمال کے مقصد تک پہنچنے کے لئے اس راستہ کو اکیلے ہی نہیں بلکہ جماعت اور معاشرہ کے ہمراہ طے کرنا چاہئے۔کیونکہ فکری،جسمانی،مادی اور معنوی لحاظ سے انفرادی طاقت کمزور ہوتی ہے اور اس کے مقابلہ میں اجتماعی طاقت بہت قوی ہوتی ہے۔

لیکن ایک معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں ایک ایسا صحیح نظام حکم فرما ہو،جو انسانی صلاحیتوں میں نکھار لائے،انحرافات اور گمراہیوں سے مقابلہ کرے،معاشرے کے تمام افراد کے حقوق کا تحفظ کرے،بلند مقاصد تک پہنچنے کے لئے پروگراموں کو منصوبہ بند طریقے پر منظم کرے اور ایک آزاد ماحول میں پورے معاشرے کو حرکت میں لانے کے عوامل یکجا کرے۔

چونکہ ایک خطا کار انسان میں ایسی عظیم ذمہ داری سنبھالنے کی صلاحیت اور طاقت نہیں ہے،جیسا کہ ہم ہمیشہ صحیح راستہ سے سیاسی حکمرانوں کے انحراف اور گمراہی کا مشاہدہ کرتے رہے ہیں،اس لئے ضروری ہے کہ خداوند متعال کی طرف سے ایک معصوم رہبران امور کی نگرانی ونظارت کرے اور لوگوں کی توانائیوں اور دانشوروں کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے انحرافات کی بھی روک تھام کرے۔

یہ امام کے وجود کے فلسفوں میں سے ایک فلسفہ اور "قاعدہ لطف" کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔ہم مکرر عرض کر رہے ہیں کہ استثنائی زمانہ میں بھی،جب امام معصوم کچھ وجوہات کی وجہ سے غائب ہوں تو لوگوں کی ذمہ داریاں واضح ہیں۔ان شاء اللہ تعالیٰ ہم "حکومت اسلامی" کی بحث میں اس پر مفصل روشنی ڈالیں گے۔

اتمام حجّت کی ضرورت

امام کے وجود کی نورانی کرنوں سے صرف آمادہ دلوں کی رہنمائی ہی مقصد نہیں ہے تا کہ وہ کمال مطلق کے راستے پر گامزن رہیں بلکہ امام کا وجودان لوگوں کے لئے بھی حجت کے طور پر ضروری ہے، جو جان بوجھ کر گمراہی کی طرف جاتے ہیں، تا کہ ان کے ساتھ وعدہ کی گئی سزا بے دلیل نہ ہواور کوئی شخص ایسا اعتراض نہ کر سکے، کہ اگر کسی الٰہی رہبر نے ہماری رہنمائی کرتے ہوئے ہمیں حق کی طرف دعوت دی ہوتی تو ہم ہر گز گمراہ نہ ہوتے۔

مختصر یہ کہ امام کے وجود کا مقصد یہ ہے کہ عذر اور بہانہ کے تمام راستے بند کر دیئے جائیں، حق کی دلیلیں کافی حدتک بیان کی جائیں، نا آگاہ لوگوں کو آگاہی فراہم کی جائے اور آگاہ افراد کو اطمینان دلا کر ان کے ارادہ کو تقویت بخشی جائے۔

امام، فیض الٰہی کا عظیم وسیلہ ہے

بہت سے علماء، اسلامی احادیث کی روشنی میں، انسانی معاشرہ یا تمام کائنات میں پیغمبر اور امام کے وجود کو انسان کے بدن میں "قلب" کے وجود سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دل کی دھڑکن کے نتیجہ میں خون تمام رگوں میں پہنچ جاتا ہے اور اس طرح بدن کی تمام خلیوں کو غذا پہنچتی ہے۔

چونکہ امام معصوم ایک انسان کامل اور کاروان انسانیت کے راہنما کی حیثیت سے فیض الٰہی کے نازل ہونے کا وسیلہ ہے اور ہر شخص پیغمبر و امام سے اپنے ارتباط کے مطابق اس فیض الٰہی سے بہرہ مند ہوتا ہے۔لہذا یہ کہنا چاہئے کہ جس طرح انسان کے لئے "دل" کا وجود ضروری ہے اسی طرح عالم انسانیت کے لئے فیض الٰہی کے اس وسیلہ (امامؑ) کا ہونا بھی ضروری ہے۔(غور فرمایئے)

مغالطہ نہ ہو، پیغمبر اور امام کے پاس اپنی کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کو عطا کریں، بلکہ ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے، لیکن جس طرح "دل" بدن کے لئے فیض الٰہی کا وسیلہ ہوتا ہے، اسی طرح پیغمبر اور امام بھی تمام انسانوں کے لئے فیض الٰہی کے سبب اور وسیلہ ہوتے ہیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ انسان کے معنوی تکامل میں امام کا کیا کردار ہے؟

۲۔ دین و مذہب کے محافظ کی حیثیت سے امام کا کیا کردار ہے؟

۳۔ حکومت اور نظام کی رہبری کے لحاظ سے امام کا کیا کردار ہے؟

۴۔ اتمام حجت سے کیا مراد ہے؟ اور اس سلسلہ میں امام کا کیا کردار ہے؟

۵۔ فیض الٰہی کے وسیلہ سے کیا مراد ہے؟ اس حوالے سے پیغمبر اور امام کے بارے میں کون سی تشبیہ بہترین تشبیہ ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تیسرا سبق: امام کے خاص شرائط وصفات

اس بحث میں سب سے پہلے اس نکتہ کی طرف توجہ کرنا ضروری ہے: قرآن مجید سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ "امامت کا مرتبہ" ایک ایسا بلند مرتبہ ہے کہ ممکن ہے ایک انسان اس مرتبہ تک پہنچ سکے۔ یہاں تک کہ یہ مرتبہ "نبوت" اور "رسالت" کے مرتبہ سے بھی بلند تر ہے۔ کیونکہ بت شکن پیغمبر حضرت ابراھیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۴ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿١٢٤﴾

"اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے چند کلمات کے ذریعہ ابراھیمؑ کا امتحان لیا اور انہوں نے اسے پورا کر دیا تو اس (خدا) نے کہا ہم تم کو لوگوں کا امام اور قائد بنا رہے ہیں۔ انہوں نے عرض کی: میری ذریت؟ ارشاد ہو یہ عہدۂ امامت ظالمین تک نہیں جائے گا۔"

اس طرح حضرت ابراھیمؑ، نبوت اور رسالت کا مرحلہ طے کرنے اور خدا کی طرف سے لئے گئے مختلف امتحانات میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد لوگوں کی ظاہری و باطنی اور مادی ومعنوی پیشوائی کے بلند مرتبہ (امامت) پر فائز ہوئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی نبوت ورسالت کے مرتبہ کے علاوہ لوگوں کی امامت ورہبری کے مرتبہ پر فائز تھے، بعض انبیاء علیہ السلام بھی اس مرتبہ پر فائز تھے، یہ ایک طرف۔

دوسری طرف ہم جانتے ہیں کہ کسی عہدہ کو سنبھالنے والے میں فرائض اور ذمہ داریوں کے مطابق شرائط اور صفات کا ہونا ضروری ہے یعنی جس قدر مرتبہ بلند تر اور ذمہ داریاں سنگین تر ہوں گی اسی تناسب سے ضروری شرائط اور صفات سنگین تر ہوں گی۔

مثلاً اسلام میں قاضی اور جج کے عہدہ پر فائز ہونے حتیٰ گواہی دینے اور امام جماعت بننے کے لئے بھی عادل ہونا ضروری ہے۔ جس مذہب میں ایک گواہی دینے یا نماز جماعت میں حمد وسورہ پڑھنے کی ذمہ داری نبھانے والے کے لئے عادل ہونا ضروری ہو، ظاہر ہے اس میں امامت کے جیسے غیر معمول اور بلند

مرتبہ پر فائز ہونے کے لئے کن شرائط کا ہونا ضروری ہوگا۔

بہرحال امام کے لئے درج ذیل شرائط کا ہونا ضروری ہے:

۱۔معصوم ہونا: امام کو پیغمبر کے مانند معصوم ہونا چاہئے یعنی اسے خطا اور گناہوں سے پاک ہونا چاہئے ۔اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ لوگوں کے لئے رہبر اور نمونہ نہیں بن سکتا ہے اور معاشرے کے لئے قابل اعتماد نہیں بن سکتا ہے۔

امام میں ایسی خصوصیات ہونی چاہئیں کہ لوگوں کے دل وجان پر حکمرانی کر سکے اور اس کا حکم کسی چون و چرا کے بغیر لوگوں کے لئے قابل قبول ہونا چاہئے ۔جو شخص گناہوں میں آلودہ ہوگا وہ کبھی ہر لحاظ سے قابل اعتماد نہیں ہوسکتا اور ایسی مقبولیت پیدا نہیں کرسکتا۔

جو شخص اپنے روزمرہ کاموں میں غلطیوں اور خطاؤں کا مرتکب ہوتا ہو، اس کے لئے کیسے ممکن ہے کہ معاشرے کے امور میں اس کے افکار ونظریات پر اعتماد کرتے ہوئے کسی چون و چرا کے بغیر عمل کیا جائے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر کو معصوم ہونا چاہئے ،امام میں بھی اس شرط کا ہونا مندرجہ بالا دلیل کے مطابق ضروری ہے۔

اس بات کو ایک اور طریقہ سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، وہ طریقہ" قاعدہ لطف" ہے۔کہ پیغمبر وامام کے وجود کی اصل کا انحصار اسی قاعدہ پر ہے اور یہ قاعدہ عصمت کی صفت کو بھی ضروری قرار دیتا ہے، کیونکہ پیغمبر وامام کے وجود مقدس کے مقاصد کی تکمیل مرتبہ عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔اس کے علاوہ گزشتہ سبق میں جو وجود امامؑ کے فلسفے ہم نے بیان کئے ہیں وہ بھی اس (صفت عصمت) کے بغیر نامکمل رہیں گے۔

۲۔بھر پور علم: امام، پیغمبر کے مانند لوگوں کے لئے علمی مامن اور پناہ گاہ ہوتا ہے۔وہ تمام اصول دین، فروع دین، قرآن مجید کے ظاہر و باطن، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور جو کچھ اسلام سے مربوط ہے ان سب کے بارے میں مکمل طور پر آگاہ وعالم ہونا چاہئے کیونکہ وہ شریعت اسلام کا محافظ بھی ہوتا ہے اور لوگوں کا رہبر و قاعد بھی ہوتا ہے۔

جو اشخاص، پیچیدہ اور مشکل مسائل پیش آنے کی صورت میں پریشان ہو کر دوسروں کی طرف دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور ان کا علم ودانش اسلامی معاشرے کو پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے سے

قاصر ہوتا ہے وہ ہرگز امامت کا منصب اورلوگوں کی رہبری وقیادت کی باگ ڈور نہیں سنبھال سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ امام کو دین الٰہی کا سب سے عظیم عالم ہونا چاہئے تاکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کی وجہ سے پیدا ہونے والے خلاء کو فوراً پر کر سکے اور صحیح اور ہر قسم کے انحرافات سے پاک اسلام کی راہ کو ثبات ودوام بخش سکے۔

۳۔شجاعت: امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی معاشرے میں شجاع ترین انسان ہو، کیونکہ شجاعت کے بغیر، رہبری وقیادت ممکن نہیں ہے۔ یہ شجاعت سخت اور ناگوا حوادث جابروں، سرکشوں ظالموں، اوراسلامی مملکت کے داخلی وخارجی دشمنوں سے مقابلہ کے لئے ضروری ہے۔

۴۔زہد وتقویٰ: ہم بخوبی جانتے ہیں کہ دنیا کی ظاہری شان وشوکت اور زرق وبرق میں گرفتار ہوئے لوگ جلد دھوکہ کھاتے ہیں اوران کے لئے حق کی راہ سے منحرف ہونے کا احتمال زیادہ ہوتا ہے۔ان دنیا پرستوں کو کبھی لالچ کے ذریعہ اور کبھی دھمکیوں سے اپنے اصلی راستہ سے منحرف کیا جاتا ہے۔

امام کو اس دنیا کی ظاہری نعمتوں کے مقابلہ میں ”اسیر“ ہونے کے بجائے ”امیر“ (بے نیاز) ہونا چاہئے۔

امام کو اس مادی دنیا کی ہر قید وبند، یعنی، نفسانی خواہشات، مقام ومنزلت، مال ودولت اور جاہ وحشم کی قیود سے آزاد و بے نیاز ہونا چاہئے تاکہ فریب، اثرورسوخ اور سازش کے دام میں پھنسا کر اسے شکست نہ دی جاسکے۔

۵۔پرکشش اخلاق: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۵۹ میں ارشاد ہوا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (سورہ آل عمران/ ۱۵۹)

”پیغمبر! یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے نرم ہو ورنہ اگر تم بدمزاج اور سخت دل ہوتے تو یہ تمھارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے“

پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام ہی نہیں بلکہ معاشرے کے ہر رہبر و پیشوا کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی پرکشش اور نیک اخلاق کا مالک ہوتا کہ وہ مقناطیس کے مانند لوگوں کو اپنی طرف کھینچ سکے۔

بیشک ہر قسم کی تندروی اور بداخلاقی، جو لوگوں میں نفرت پیدا ہونے کا سبب ہوتی ہے، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امام کے لئے بہت بڑا عیب شمار ہوتی ہے وہ ایسے عیوب سے پاک ومنزّہ ہوتے ہیں، ورنہ (امامؑ) کے بہت سے وجودی فلسفے بے کار ہو کر رہ جائیں گے۔

یہ اہم ترین شرائط ہیں، جو عظیم علماء نے امام کے لئے بیان کئے ہیں۔

البتہ مذکورہ پانچ صفات کے علاوہ بھی امام کے لئے کچھ مزید صفات اور شرائط کا ہونا ضروری ہے ،لیکن ان میں سے اہم ترین صفات یہی ہیں جن کا ذکر ہم نے کیا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔منصب امامت کس دلیل سے انسان کے لئے ایک بلند ترین منصب ہے؟

۲۔کیا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دیگر اولوالعزم انبیاء علیہم السلام بھی امامت کے منصب پر فائز تھے؟

۳۔اگر امام معصوم نہ ہو تو کون سی مشکل پیش آسکتی ہے؟

۴۔امام میں بھرپور علم کا ہونا کیوں ضروری ہے؟

۵۔کس دلیل کی بناء پر امام کو سب سے شجاع، باتقویٰ، زاہد اور اخلاقی لحاظ سے پرکشش ہونا چاہئے۔

چوتھا سبق: امام کا تعیّن کس کے ذمہ ہے؟

مسلمانوں کے ایک گروہ (اہل سنّت) کا یہ عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی حالت میں رحلت فرمائی کہ آپ نے اپنے بعد کسی کو جانشین کے طور پر مقرر و معیّن نہیں فرمایا تھا۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ ذمہ داری خود مسلمانوں کی ہے کہ اپنے لئے رہبر اور پیشوا کو منتخب کریں اور اس کام کو "اجماع مسلمین" کے طریقہ سے انجام دیں جو دلائل شرعی میں سے ایک دلیل ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد یہ کام انجام پایا اور سب سے پہلے خلیفہ اول امت کے اجماع کے ذریعہ خلافت کے عہدے پر منتخب کئے گئے۔ جبکہ پہلے خلیفہ نے (اجماع امت کے بجائے) خود ذاتی طور پر (وصیت کے ذریعہ) دوسرے خلیفہ کو مقرر کیا۔

اس کے بعد دوسرے خلیفہ نے چھ افراد پر مشتمل ایک شوریٰ تشکیل دی تا کہ یہی لوگ ان کے بعد ان کے جانشین کو منتخب کریں۔

اس شوریٰ کے اراکین: حضرت علیؑ، عثمان، عبدالرحمان بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص تھے۔

اس شوریٰ نے تین اراکین کی اکثریت سے، یعنی سعد بن ابی وقاص، عبدالرحمان بن عوف اور طلحہ کی رائے سے عثمان کو منتخب کیا۔ دوسرے خلیفہ نے صراحت کی تھی کہ شوریٰ کے اراکین کی رائے تین تین افراد پر برابر تقسیم ہو جانے کی صورت میں جس طرف عبدالرحمان بن عوف (عثمان کے بہنوئی) کی رائے ہو وہی خلیفہ منتخب کیا جائے!

عثمان کی خلافت کے آخری دنوں میں لوگوں نے مختلف دلائل کی بناء پر ان کے خلاف بغاوت کی اور اس سے پہلے کہ وہ ذاتی طور پر یا شوریٰ کے ذریعہ اپنا جانشین مقرر کرتے، انھیں قتل کر ڈالا۔

اس وقت عام مسلمانوں نے حضرت علی علیہ السلام کی طرف رخ کیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے آپؑ کی بیعت کی۔ صرف شام کے گورنر معاویہ نے حضرت علی علیہ السلام کی بیعت سے انکار کیا، کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ حضرت علیؑ اسے موجودہ عہدے پر باقی نہیں رکھیں گے۔

معاویہ نے نہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی بیعت ہی نہیں کی بلکہ آپؑ کے خلاف بغاوت کا جھنڈا

بلند کر دیا اور اس طرح تاریخ اسلام میں ناگوار، مرگ آور اور منحوث حوادث کا دور شروع ہوا جس کے نتیجہ میں بے گناہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد کا خون بہہ گیا۔

یہاں پر علمی اور تاریخی بحثوں کے واضح ہونے کے لحاظ سے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں ہم ان میں سے چند سوالات پر بحث کر رہے ہیں:

ا۔ کیا امت کو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین منتخب کرنے کا حق ہے؟

اس سوال کا جواب مشکل اور پیچیدہ نہیں ہے۔ اگر ہم امامت کو اسلامی معاشرہ کی ظاہری حکمرانی جان لیں تو ایسے حاکم کو لوگوں کی رائے سے منتخب کرنا رائج ہے۔

لیکن اگر ہم امامت کو اس معنی میں لیں، جس کی وضاحت ہم پہلے قرآن مجید کی روشنی میں کر چکے ہیں، تو کسی شک وشبہہ کے بغیر، خداوند متعال یا وحی الٰہی سے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی بھی شخص امام اور خلیفہ کو معین نہیں کر سکتا ہے۔

کیونکہ اس تفسیر کے مطابق امامت کی شرط اسلام کے تمام اصول وفروع میں بھر پور علم رکھنا ہے ایسا علم جس کا سرچشمہ علم الٰہی اور علم پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتا کہ وہ شریعت اسلام کی حفاظت کر سکے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ امام معصوم ہونا چاہئے، یعنی اسے خدا کی طرف سے ہر خطا و گناہ سے پاک ومنزّہ ہونے کی ضمانت حاصل ہوتا کہ معاشرے کی معنوی و مادی، ظاہری و باطنی رہبری و قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکے۔

اس کے علاوہ امام یا خلیفہ کو اس منصب کے لئے ضروری زہد وتقویٰ، پرہیز گاری اور شجاعت کا حامل بھی ہونا چاہئے۔

یہ بات یقینی ہے کہ ان شرائط کی تشخیص خدا اور پیغمبر کے علاوہ کسی اور کے ذریعہ ممکن نہیں ہے۔ وہی (خدا ہی) یہ جانتا ہے کہ کس شخص کی روح عصمت کے نور سے منور ہے اور وہی جانتا ہے کہ منصب امامت کے لئے ضروری علم، تقویٰ، پرہیز گاری، شجاعت وشہامت کس شخص میں موجود ہے۔

جن لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ اور امام کا تعیّن لوگوں کے ہاتھ میں دے دیا ہے، انہوں نے حقیقت میں امامت کے قرآنی مفہوم میں تبدیلی ایجاد کر کے امامت کو عام حکمرانی اور دنیوی امور میں لوگوں کی رہبری تک محدود کر کے رکھ دیا ہے ورنہ جامع اور کامل معنی میں امامت کے شرائط

پروردگار عالم کے ذریعہ ہی قابل تشخیص ہیں اور وہی ان صفات کے بارے میں مکمل علم وآ گاہی رکھتا ہے۔

امام کا انتخاب بھی بالکل اسی طرح کیا جاتا ہے جس طرح پیغمبر کا انتخاب کیا جاتا ہے۔پیغمبر کا انتخاب لوگوں کی رائے سے نہیں کیا جاسکتا بلکہ ضروری ہے کہ پیغمبر کا انتخاب خداوند متعال کی طرف سے ہواور معجزات کے ذریعہ اس کی پہچان کروائی جائے اس لئے کہ پیغمبر میں پائی جانے والی ضروری صفات کی تشخیص بھی صرف خداوند متعال ہی کرسکتا ہے۔

۲۔کیا پیغمبر نے اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا ہے؟

بیشک دین اسلام ایک "عالمی"اور"لافانی" دین ہے اور قرآن مجید کی واضح آیات کے مطابق یہ دین کسی خاص زمان ومکان سے مخصوص نہیں ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ سلم کی رحلت کے زمانہ تک یہ الٰہی اور آسمانی دین جزیرۂ عرب سے باہر نہیں پھیلا تھا۔

دوسری طرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی زندہ گی کے تیرہ سال مکہ میں شرک وبت پرستی سے مبارزہ اور مقابلہ کرنے میں گزر گئے اور ہجرت کے بعد، جو اسلام کے پھلنے اور پھولنے کا دور تھا، آپ کی زندہ گی کے باقی دس سال بیشتر دشمنوں کی طرف سے تھوپی گئی جنگوں اور غزوات میں صرف ہو گئے۔

اگر چہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے مسائل کی تبلیغ اور تعلیم کے لئے دن رات انتھک کوشش کی اور اور نوعمر اسلام کا تمام جہات میں تعارف فرمایا، پھر بھی یقیناً اسلام کے بہت سے ایسے مسائل باقی تھے جن کی تفسیر وتشریح کے لئے مزید وقت درکار تھا، اس لئے ضروری تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی جیسا کوئی شخص آپ کے بعد اس سنگین ذمہ داری کو سنبھالے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ مستقبل کے حالات کی پیشنگوئی کے پیش نظر مذہب کو دوام بخشنے کے مقدمات کو فراہم کرنا ان اہم امور میں سے ہے کہ ہر رہبر اور قائد کو اس کی فکر ہوتی ہے اور ہرگز اس بات کے لئے آمادہ نہیں ہوتا ہے کہ اس بنیادی مسئلہ کو فراموش کردے۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے بعض اوقات انسانی زندگی کے معمولی اور سادہ مسائل کے بارے میں بھی احکام بیان فرمائے ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ آپ نے مسلمانوں کی خلافت، زعامت اور امامت جیسے اہم مسئلہ کے بارے میں کوئی دستور معیّن نہیں فرمایا ہوگا؟!

مذکورہ تین نکات کا مجموعہ اس بات پر واضح دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جانشین مقرر کرنے کا قطعاً اقدام فرمایا ہے۔ انشااللہ ہم بعد میں اس سلسلہ میں قطعی اور مسلّم الثبوت روایتوں کے چند نمونے بھی پیش کریں گے تا کہ یہ منطقی حقیقت اور بھی زیادہ واضح ہو جائے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہرگز اپنی زندگی کے دوران اس اہم اور حیاتی مسئلہ سے غافل نہیں رہے ہیں، اگر چہ خاص سیاسی وجوہات کی بناء پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کے ذہنوں میں یہ تصور پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا ہے۔

کیا یہ بات قابل یقین ہے کہ جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوات (جیسے غزوہ تبوک) کے دوران صرف چند دنوں کے لئے مدینہ منورہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو ضرور اپنی جگہ پر کسی کو جانشین مقرر فرماتے تھے اور اپنی جگہ خالی نہیں رکھتے تھے، لیکن اپنی رحلت کے بعد کی کوئی پروا کئے بغیر کسی قسم کا اقدام نہ فرمائیں، اور امت کو اختلافات اور سرگردانی کے طوفان میں اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ہر ایک رہبر کے ذریعہ اسلام کے دوام کی ضمانت فراہم نہ فرمائیں؟!

اگر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا جانشین مقرر نہ فرماتے تو یقیناً نوعمر اسلام کے لئے بڑے خطرات لاحق ہوتے۔ عقل اور منطق اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کام انجام دیں جس سے اسلام کو خطرات لاحق ہوں۔ جن لوگوں کا یہ دعویٰ ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کام امت کے ذمہ چھوڑ دیا ہے، وہ اپنے اس نظریہ کی تائید میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کم از کم ایک دلیل تو پیش کریں، جس سے ثابت ہو جائے کہ پیغمبر اسلام نے اس نظریہ کی تاکید فرمائی ہے!، جبکہ ان کے پاس اس سلسلہ میں کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے۔

۳۔ اجماع اور شوریٰ

فرض کریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے (اپنا جانشین مقرر کرنے کے) اس نہایت اہم مسئلہ کو نظر انداز کیا ہو اور خود مسلمانوں پر اس (خلیفہ) کے انتخاب کرنے کی ذمہ داری ہو لیکن ہم جانتے ہیں کہ "اجماع" سے مراد تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور پہلے خلیفہ کی خلافت کے بارے میں ہرگز ایسا اتفاق یا اجماع حاصل نہیں ہوا ہے۔ صرف مدینہ میں موجود اصحاب میں سے چند صحابیوں نے اس بات کا فیصلہ کیا، جبکہ تمام اسلامی شہروں کے لوگوں نے اس فیصلہ میں بالکل شرکت نہیں کی، بلکہ خود مدینہ میں موجود حضرت علیؑ

اور بنی ہاشم کے بہت بڑے گروہ نے اس انتخاب میں کسی قسم کی شرکت نہیں کی، اس لئے یہ اجماع قطعاً قابل قبول نہیں ہے۔

پھر اگر یہ طریقہ صحیح تھا، تو پہلے خلیفہ نے اپنا جانشین مقرر کرنے کے سلسلہ میں کیوں اس پر عمل نہیں کیا؟ انھوں نے کیوں ذاتی طور پر اپنا جانشین نامزد کیا؟ اگر ایک شخص کی طرف سے جانشین کو مقرر کرنا کافی ہوتا تو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کام کے لئے سب سے افضل واولیٰ تھے۔ اگر لوگوں کی طرف سے بعد میں کی جانے والی بیعت اس مشکل کو حل کرسکتی ہے تو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہی بیعت بہرصورت میں مسئلہ کو حل کرسکتی ہے۔

اس کے علاوہ تیسری مشکل "خلیفہ سوم" کے بارے میں پیش آتی ہے، کہ دوسرے خلیفہ نے کیوں پہلے خلیفہ کے منتخب ہونے کے طریقہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور جس طریقہ سے خود برسر اقتدار آئے تھے، اس کو بھی توڑ دیا یعنی نہ "اجماع" پر عمل کیا اور نہ ذاتی طور پر کسی کو نامزد کیا بلکہ اس کام کے لئے ایک تیسرا طریقہ ایجاد کرکے ایک محدود شوریٰ کو اس کام کی ماموریت دے دی۔

اصولی طور پر اگر شوریٰ صحیح ہے تو یہ شوریٰ کیوں صرف چھ افراد تک محدود ہو؟ اور چھ ارکان میں سے صرف تین ہی کی رائے کافی ہو؟

یہ وہ سوالات ہیں جو تاریخ اسلام کے ہر محقق کو پیش آتے ہیں اور ان سوالات کا جواب نہ ملنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام اور خلیفہ کے انتخاب کے مذکورہ طریقے صحیح نہیں ہیں۔

۴۔ علیؑ سب سے لائق وافضل تھے۔

اگر ہم فرض کریں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمنے کسی بھی شخص کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا تھا، اور یہ بھی فرض کرلیں کہ یہ کام لوگوں پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ خلیفہ اور امام کو منتخب کرنے کے وقت ایک ایسے شخص کو نظرانداز کردیا جائے جو علم، تقویٰ، پرہیزگاری شجاعت اور دوسرے امتیازات و خصوصیات کے لحاظ سے سب سے افضل ہو اور اس کے بجائے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا جائے جو اس سے نہایت کمتر ہو؟!

علماء اسلام کی ایک بڑی تعداد، حتی کہ اہل سنت علماء نے واضح طور پر لکھا ہے کہ اسلامی مسائل سے آگاہی اور علم رکھنے کے حوالے سے حضرت علیؑ سب سے افضل تھے۔ خود حضرتؑ سے باقی ماندہ روایات اور

آثار اس حقیقت کے روشن ثبوت ہیں۔تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ حضرت علیؑ تمام علمی مشکلات کو حل کرنے میں امت کے پناہ گاہ تھے، یہاں تک کہ اگر کبھی خلفاء کو بھی کوئی پیچیدہ یا مشکل مسئلہ پیش آتا تھا، وہ حضرتؑ کی طرف رجوع کرتے تھے اور آپؑ سے مدد طلب کرتے تھے۔

حضرت علیؑ شجاعت، علم، تقویٰ، پرہیزگاری اور دوسری صفات کے لحاظ سے سب سے افضل تھے اس لئے اس فرض کی بناء پر کہ لوگوں کو امام و خلیفہ چننے کا حق تھا، پھر بھی علیؑ اس منصب کے لئے سب سے زیادہ لائق اور شائستہ تھے۔(البتہ اس بحث سے متعلق کافی اسناد موجود ہیں، جن کا ذکر اختصار کے پیش نظر یہاں پر ممکن نہیں ہے)۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ یا امام کو لوگ کیوں منتخب نہیں کر سکتے؟
۲۔کیا عقل و منطق یہ بات مانتی ہے کہ پیغمبر نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا تھا؟
۳۔ پہلے تین خلفاء کا انتخاب کن طریقوں سے عمل میں آیا؟
۴۔کیا پہلے تین خلفاء کے انتخاب کا طریقہ علمی اور اسلامی اصولوں کے مطابق تھا؟
۵۔کن دلائل کی بناء پر علیؑ سب سے لائق ہیں؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پانچواں سبق: قرآن اور امامت

عظیم آسمانی کتاب قرآن مجید، دوسری تمام چیزوں کے مانند امامت کے مسئلہ میں بھی ہمارے لئے بہترین راہنما ہے۔ قرآن مجید نے مسئلہ امامت پر مختلف جہات سے بحث کی ہے۔

۱۔ قرآن مجید "امامت" کو خدا کی جانب سے جانتا ہے:

جیسا کہ ہم نے گزشتہ بحثوں میں حضرت ابراھیمؑ بت شکن کی داستانوں میں پڑھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں حضرت ابراھیمؑ کو نبوت اور رسالت پر فائز ہونے اور مختلف امتحانات میں کامیاب ہونے کے بعد امامت کے عہدہ پر قرار دیا ہے۔ اور سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۲۴ میں ارشاد فرمایا ہے:

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

"اور اس وقت کو یاد کرو جب خدا نے چند کلمات کے ذریعہ ابراھیم کا امتحان لیا اور انہوں نے پورا کر دیا تو اس نے کہا ہم تم کو لوگوں کا امام بنا رہے ہیں۔"

قرآن مجید کی مختلف آیات اور تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراھیمؑ بابل کے بت پرستوں سے مبارزہ کرنے، شام کی طرف ہجرت کرنے اور خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو قربان گاہ میں لے جانے کے بعد امامت کے منصب پر فائز ہوئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت کا عہدہ خدا کی طرف سے معیّن ہونا ضروری ہے تو مخلوق کی ہمہ جہت امامت و رہبری کا مرتبہ بطریق اولیٰ خدا کی طرف سے معیّن ہونا ضروری ہے، کیونکہ امامت کا مرتبہ رہبری کے تکامل کی معراج ہے۔ اس لئے یہ کوئی ایسی معمولی چیز نہیں ہے جسے لوگ انتخاب کریں۔

پھر قرآن مجید خود مذکورہ آیت میں فرماتا ہے:

اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ

"میں تم کو امام و پیشوا قرار دینے والا ہوں۔"

اسی طرح سورۂ انبیاء کی آیت نمبر ۷۳ میں بھی بعض باعظمت انبیاء جیسے: حضرت ابراھیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت اسحاقؑ اور حضرت یعقوبؑ کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

وَجَعَلۡنٰهُمۡ اَىِٕمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا

"اورہم نے ان سب کو پیشوا قرار دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے"

اس قسم کی تعبیریں قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ملتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ الٰہی منصب خداوند متعال کے توسط سے ہی معیّن ہونا چاہئے۔

اس کے علاوہ ہم حضرت ابراھیمؑ کی امامت سے متعلق مذکورہ آیت کے آخری حصہ میں پڑھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے فرزندوں اور آنے والی نسل کے لئے اس منصب کی درخواست کی تو اللہ کی طرف سے یہ جواب ملا:

لَا يَنَالُ عَهۡدِى الظّٰلِمِيۡنَ﴿۱۲۴﴾

"میرا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا"

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ آپ کی دعا قبول ہوئی، لیکن آپ کے فرزندوں میں سے جو ظلم کے مرتکب ہونے والے ہیں وہ ہرگز اس مرتبہ پر فائز نہیں ہوں گے۔

قابل ذکر بات ہے کہ لغوی اور قرآن مجید کی منطق کے اعتبار سے "ظالم" کے وسیع معنیٰ ہیں اور اس میں تمام گناہ من جملہ ان کے آشکار و مخفی شرک اور اپنے اوپر اور دوسروں پر ہر قسم کا ظلم شامل ہے۔ چونکہ خداوند متعال کے علاوہ کوئی اس امر سے مکمل طور پر آگاہ نہیں ہے، کیونکہ صرف خدا ہی لوگوں کی نیتوں اور باطن سے آگاہ ہے، اس لئے واضح ہوتا ہے کہ اس مرتبہ و منصب کا تعیّن صرف خداوند متعال کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ آیہ تبلیغ

سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ٦٧ میں یوں ارشاد ہوا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الرَّسُوۡلُ بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَيۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ‌ؕ وَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلۡ فَمَا بَلَّغۡتَ رِسَالَـتَهٗ‌ؕ وَاللّٰهُ يَعۡصِمُكَ مِنَ النَّاسِ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهۡدِى الۡقَوۡمَ الۡـكٰفِرِيۡنَ﴿۶۷﴾

"اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا کہ اللہ کافروں کی ہدایت نہیں کرتا ہے۔"

اس آیہ شریفہ کے لہجہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوش مبارک پر ایک سنگین مأموریت ڈالی گئی ہے اور اس سلسلہ میں ہر طرف کچھ خاص قسم کی پریشانیاں پھیلی تھیں، یہ ایسا پیغام تھا کہ ممکن تھا لوگوں کے ایک گروہ کی طرف سے اس کی مخالفت کی جاتی، اس لئے آیہ شریفہ تاکید کے ساتھ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیتی ہے اور ممکنہ خطرات اور پریشانیوں کے مقابلہ میں آپ کو خاطر خواہ اطمینان دلاتی ہے۔

یقینا یہ اہم مسئلہ توحید، شرک یا یہودو منافقین جیسے دشمنوں سے جہاد کرنے سے مربوط نہیں تھا، کیونکہ اس زمانہ (سورۂ مائدہ نازل ہونے) تک یہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہو چکا تھا۔

اسلام کے دوسرے احکام پہنچانے کے سلسلہ میں بھی اس قسم کی پریشانی اور اہمیت نہیں تھی، کیونکہ مذکورہ آیت کے مطابق بظاہر یہ حکم رسالت کے ہم وزن اور ہم پلہ تھا کہ اگر یہ حکم نہ پہنچایا جاتا تو رسالت کا حق ادا نہیں ہوتا۔ کیا یہ مسئلہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی اور خلافت کے علاوہ کچھ اور ہوسکتا ہے؟ خاص کر جب کہ یہ آیت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر شریف کے آخری دنوں میں نازل ہوئی ہے اور یہ خلافت کے مسئلہ کے ساتھ تناسب بھی رکھتا ہے، جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت ونبوت کی بقا کا وسیلہ ہے۔

اس کے علاوہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے صحابیوں کی ایک بڑی تعداد، من جملہ زید بن ارقم، ابوسعید خدری، ابن عباس، جابر بن عبداللہ انصاری، ابو ہریرہ، حذیفہ اور ابن مسعود سے اس سلسلہ میں کثیر تعداد میں روایتیں نقل ہوئی ہیں اور ان میں سے بعض روایتیں گیارہ واسطوں سے ہم تک پہنچی ہیں اور اہل سنت علماء، مفسرین، محدثین اور مورخین نے بھی انھیں نقل کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ مذکورہ آیت حضرت علیؑ اور غدیر کے واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔(۱)

ان شاء اللہ ہم "غدیر" کی داستان کو "روایات وسنت" کے عنوان سے آئندہ بحث میں تفصیل سے بیان کریں گے۔ لیکن یہاں پر ہم اسی یاددہانی پر اکتفا کرتے ہیں کہ یہ آیت اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرض تھا کہ اپنی زندگی کے آخری حج سے لوٹتے وقت حضرت علیؑ کو باضابطہ طور پر اپنا جانشین معیّن کریں اور تمام مسلمانوں کو ان کا تعارف کرائیں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۳۔آیہ اولی الامر

سورۂ نساء کی آیت نمبر ۵۹ میں ارشاد ہوا ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ

"ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اور صاحبان امر کی اطاعت کرو جو تمھیں میں سے ہیں یہاں پر اولوالامر کی اطاعت کسی قید وشرط کے بغیر خدا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے ہمراہ بیان ہوئی ہے۔

کیا "اولوالامر" سے مراد ہر زمان ومکان کے حکام اور فرمانروا ہیں؟ مثلاً کیا ہمارے زمانے میں ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض ہے کہ اپنے حکام اور فرمانرواؤں کی اطاعت کریں؟ (جیسا کہ اہل سنت کے بعض مفسرین نے بیان کیا ہے)

یہ بات عقل ومنطق کی کسی کسوٹی پر ہرگز نہیں اترتی ہے، کیونکہ اکثر حکمراں مختلف زمانوں اور عصروں میں منحرف، گناہ کار، دوسرے ملکوں کے ایجنٹ اور ظالم ہوئے ہیں۔ کیا اس سے مراد یہ ہے کہ ان حکمرانوں کی پیروی واطاعت کی جانی چاہئے جن کا حکم اسلامی احکام کے خلاف نہ ہو؟ یہ بھی آیت کے مطلق ہونے کے خلاف ہے۔

کیا اس سے مراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے مخصوص اصحاب ہیں؟ یہ احتمال بھی اس آیت کے وسیع مفہوم (جو ہر دور اور زمانے کے لئے ہے) کے خلاف ہے۔

اس لئے ہمارے لئے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سے مراد معصوم پیشوا ہے جو ہر دور اور زمانے میں موجود ہوتا ہے اور اس کی اطاعت کسی قید وشرط کے بغیر واجب ہوتی ہے اور اس کا حکم، خدا ورورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مانند واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں اسلامی منابع ومآخذ میں موجود متعدد احادیث میں "اولوالامر" کی حضرت علیؑ اور ائمہ معصومین سے کی گئی تطبیق بھی اس حقیقت کی گواہ ہے۔(۱)

۱۔مزید تفصیلات کے لئے تفسیر نمونہ ج ۳: ص ۴۳۵ کا مطالعہ کریں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

۴۔آیہ ولایت

سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوا ہے:

إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللهُ وَرَسُولُهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ﴿۵۵﴾

"ایمان والو بس تمھارا ولی اللہ ہے اور اس کا رسول اور وہ صاحبان ایمان جو نماز قائم کرتے ہیں اور حالت رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں۔"

عربی لغت میں لفظ "اِنما" انحصار کے لئے استعمال ہوتا ہے، اس بات کے پیش نظر قرآن مجید نے مسلمانوں کی قیادت اور ولایت و سرپرستی کو صرف تین اشخاص میں منحصر فرمایا ہے: "خدا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں اور رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دیتے ہیں"۔

اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ "ولایت" سے مراد مسلمانوں کی آپس دوستی نہیں ہے کیونکہ مسلمانوں کی عام دوستی کے لئے قید وشرط کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تمام مسمان آپس میں دوست اور بھائی بھائی ہیں اگر چہ رکوع کی حالت میں کوئی زکوٰۃ بھی نہ دے۔ اس لئے یہاں پر "ولایت" وہی مادی ومعنوی رہبری اور سرپرستی کے معنی میں ہے، بالاخص جب کہ یہ ولایت، خدا کی ولایت اور پیغمبر کی ولایت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔

یہ نکتہ بھی واضح ہے کہ مذکورہ آیت میں ذکر شدہ اوصاف ایک مخصوص شخص سے مربوط ہیں، جس نے رکوع کی حالت میں زکوٰۃ دی ہے، ورنہ یہ کوئی ضروری امر نہیں ہے کہ انسان نماز کے رکوع کی حالت میں زکوٰۃ ادا کرے، حقیقت میں یہ ایک نشاندہی ہے نہ توصیف۔

ان تمام قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا آیہ شریفہ حضرت علیؑ کی ایک مشہور داستان کی طرف ایک پرمعنیٰ اشارہ ہے کہ حضرت علیؑ نماز کے رکوع میں تھے، ایک حاجتمند نے مسجد نبوی میں مدد کی درخواست کی۔ کسی نے اس کا مثبت جواب نہیں دیا۔ حضرت علیؑ نے اسی حالت میں اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اشارہ کیا۔ حاجتمند نزدیک آگیا۔ حضرت علیؑ کے ہاتھ میں موجود گراں قیمت انگوٹھی کو اتار کر لے گیا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس واقعہ کا مشاہدہ فرمایا تو نماز کے بعد اپنے سر مبارک کو آسمان کی طرف بلند

کر کے یوں دعا کی: پروردگارا! میرے بھائی موسیٰ نے تجھ سے درخواست کی کہ ان کی روح کو کشادہ، کام کو آسان اور ان کی زبان کی لکنت کو دور فرمادے اور ان کے بھائی ہارون کو ان کا وزیر اور مددگار بنادے پروردگارا! میں محمد، تیرا منتخب پیغمبر ہوں، میرے سینہ کو کشادہ اور میرے کام مجھ پر آسان فرما، میرے خاندان میں سے علیؑ کو میرا وزیر قرار دے تاکہ اس کی مدد سے میری کمر قوی اور مضبوط ہو جائے"

ابھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا ختم نہیں ہوئی تھی کہ مذکورہ بالا آیہ شریفہ کو لے کر جبرئیل امین نازل ہوئے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اہل سنّت کے بہت سے عظیم مفسرین، مورخین اور محدثین نے اس آیہ شریفہ کی شان نزول کو حضرت علیؑ کے بارے میں نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے ایک گروہ نے، جن کی تعداد دس سے زیادہ ہے، اس حدیث کو خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست نقل کیا ہے۔(2)

ولایت کے موضوع پر قرآن مجید میں بہت سی آیات ذکر ہوئی ہیں، ہم نے کتاب کے اختصار کے پیش نظر صرف مذکورہ چار آیتوں پر ہی اکتفا کیا۔

ا۔مزید تفصیلات کے لئے کتاب "احقاق الحق"، "الغدیر"، "المراجعات" اور "دلائل الصدق" کا مطالعہ کریں۔

2۔مزید توضیح کے لئے قیمتی کتاب "المراجعات" کا مطالعہ فرمائیے، جس کا اردو ترجمہ "دین حق" کے نان سے ہو چکا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

ا۔قرآن کی روشنی میں امام کو منتخب و معین کرنا کس کے ذمہ ہے؟

۲۔آیہ تبلیغ کن حالات میں نازل ہوئی ہے اور اس کا مفہوم کیا ہے؟

۳۔کن شخصیات کی بلا قید و شرط اطاعت کرنا عقل کے مطابق ہے؟

۴۔آیہ "اِنّما ولیکم اللّٰہ" کن دلائل کی بناء پر رہبری اور امامت کی طرف اشارہ ہے۔

۵۔مسئلہ ولایت کے بارے میں موجود قرآن مجید کی تمام آیات سے کن مسائل کے سلسلہ میں استفادہ کیا جاسکتا ہے؟

امامت کے دس سبق

چھٹا سبق: امامت، سنّت نبی کی روشنی میں

اسلامی احادیث سے مربوط کتابوں، بالخصوص اہل سنت بھائیوں کی طرف سے تألیف کی گئی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے دوران انسان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی احادیث کی ایک کثیر تعداد سے روبرو ہوتا ہے جو واضح طور پر حضرت علیؑ کی امامت وخلافت کو ثابت کرتی ہیں۔

حیرت کی بات ہے کہ اتنی احادیث موجود ہونے کے باوجود اس مسئلہ کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہہ باقی نہیں رہ جاتا تو پھر ایک گروہ اہل بیتؑ کی راہ سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ کیسے اختیار کر لیتا ہے؟

یہ احادیث، جن میں سے بعض کے اسناد سینکڑوں تک ہیں (جیسے حدیث غدیر) اور بعض کے اسناد دسیوں تک اور دسیوں مشہور اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہیں، ایسی واضح اور روشن ہیں کہ اگر ہم تمام گفتگوؤں کو نظر انداز کر دیں اور کسی کی تقلید کرنا چھوڑ دیں، تو وہ مسئلہ ہمارے لئے ایسا واضح ہو جائے گا کہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔

ان احادیث کے مخزن سے ہم یہاں پر چند مشہور احادیث کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اس موضوع پر بیشتر اور گہرے مطالعہ کا شوق رکھنے والوں کے لئے ہم بعض منابع (کتابوں) کی نشاندہی کرتے ہیں تاکہ ان سے استفادہ کریں۔(۱)

۱۔ حدیث غدیر

مورخین اسلام کی ایک بہت بڑی تعداد نے لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے آخری سال حج بجالائے۔ فریضہ حج کو بجالانے کے بعد جبکہ حجاز کے مختلف علاقوں سے حج کے لئے آئے ہوئے آپ کے نئے اور پرانے صحابیوں اور اسلام کے عاشقوں کی ایک بڑی تعداد آپ کے ساتھ تھی۔ مکہ

سے واپسی پر یہ عظیم اجتماع، مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع "جحفہ" نامی ایک جگہ سے گزرتے ہوئے "غدیر خم" کے نام پر ایک خشک اور گرم بیابان میں پہنچ گیا۔ درحقیقت یہ ایک چوراہا تھا۔ جہاں پر حجاز کے تمام لوگوں کے راستے جدا ہوتے تھے۔

یہاں پر حجاز کے مختلف علاقوں کی طرف جانے والے مسلمانوں کے ایک دوسرے سے جدا ہونے سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو رکنے کا حکم دیا۔ جو آگے بڑھے تھے انھیں واپس آنے کا حکم دیا اور پیچھے سے آنے والوں کا انتظار کیا گیا، اس طرح سب ایک جگہ جمع ہو گئے۔ ہوا انتہائی گرم اور دھوپ نہایت جھلسا دینے والی تھی۔ بیابان میں دور دور تک کہیں کوئی سائبان نظر نہیں آرہا تھا۔ مسلمانوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت میں ظہر کی نماز پڑھی۔ جب ان سب نے نماز کے بعد اپنے خیموں کی طرف جانا چاہا تو پیغمبر اسلام نے حکم دیا کہ سب لوگ ٹھہر جائیں اور ایک مفصل

۱۔ بیشتر وضاحت کے لئے کتاب "المراجعات"، "الغدیر" اور "نوید امن وامان" کی طرف رجوع کریں۔

خطبہ کے ضمن میں ایک اہم الٰہی پیغام کو سننے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

اونٹوں کے پالانوں کا ایک منبر بنایا گیا اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر تشریف لے گئے آپ نے حمد وثنائے الٰہی کے بعد لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

میں خدا کی دعوت کو لبیک کہتے ہوئے جلدی ہی تمھارے درمیان سے رخصت ہونے والا ہوں۔ میں ذمہ دار ہوں اور تم لوگ بھی ذمہ دار ہو۔ تم لوگ میرے بارے میں کس طرح کی شہادت دیتے ہو؟

لوگوں نے بلند آواز سے کہا:

"نشهد انك قد بلغت و نصحت و جهدت فجزاك الله خيرا"

"ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے رسالت کی ذمہ داریاں نبھائیں اور ہماری بھلائی کے لئے ہماری نصیحت کی اور ہماری ہدایت میں نہایت کوشش کی، خداوند متعال آپ کو جزائے خیر دے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا تم لوگ خدا کی وحدانیت، میری رسالت اور قیامت کی حقیقت اور اس دن مردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کی شہادت دیتے ہو؟

جواب میں سب نے یک زبان ہو کر کہا: جی ہاں، ہم گواہی دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا:

خداوندا! گواہ رہنا

آپ نے دوبارہ فرمایا: اے لوگوں! کیا میری آواز سن رہے ہو؟ انہوں نے کہا: جی ہاں۔

اس کے بعد پورے بیابان میں چاروں طرف خاموشی چھا گئی اور ہوا کی سنسناہٹ کی آواز کے علاوہ کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا: اب بتاؤ کہ ان دو گرانقدر چیزوں کے ساتھ تم لوگ کیسا سلوک کروگے جو میں تمھارے درمیان یادگار کے طور پر چھوڑے جارہا ہوں؟

مجمع میں سے کسی نے بلند آورز سے سوال کیا: کون سی دو گرانقدر چیزیں، یارسول اللہ؟!

پیغمبر نے فرمایا: پہلی چیز "ثقل اکبر" یعنی کتاب الٰہی "قرآن مجید" ہے۔ اس کے دامن کو ہرگز نہ چھوڑنا تاکہ گمراہ نہ ہوجاؤ۔ اور دوسری گرانقدر یادگار چیز میرے اہل بیت ہیں۔ خداوند لطیف وخبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دو چیزیں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہونگیں یہاں تک کہ بہشت میں مجھ سے مل جائیں، ان دونوں سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے۔ اور ان سے پیچھے بھی نہ رہنا، کیونکہ اس صورت مین بھی ہلاک ہوجاؤ گے۔

اس دوران اچانک آپؐ نے اپنی نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں، جیسے کہ آپ کو کسی کی تلاؤ تھی۔ جوں ہی آپ کی نظر حضرت علیؑ پر پڑی، آپ جھک گئے اور ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اتنا بلند کیا کہ دونوں کی بغلوں کی سفیدی دکھائی دے رہی تھی۔ سب لوگوں نے حضرت علیؑ کو دیکھا اور انھیں پہچان لیا۔

اس موقع پر آنحضرت نے اور زیادہ بلند آواز کے ساتھ رفرمایا:

ایّھا النّاس! من اولی النّاس بالمومنین من انفسھم؟

لوگو! لوگوں میں سے کون شخص مومنین پر خود ان سے بھی زیادہ سزاورا ہے؟

سب نے جواب میں کہا: خدا اورس کا رسولؐ بہتر جانتا ہے۔

پیغمبر نے فرمایا:

"خداوند متعال میرا مولا اور رہبر ہے، اور میں مؤمنین کا مولا ورہبر ہوں اور ان کی نسبت خود ان سے بھی زیادہ حق رکھتا ہوں۔"

اس کے بعد فرمایا:

"فمن کنت مولاہ فعلی مولاہ"

"جس جس کا میں مولا اور رہبر ہوں، اس اس کے علیؑ بھی مولا ہیں"

آنحضرت نے اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا، بعض راویان حدیث کے مطابق اس جملہ کو چار مرتبہ دہرایا، اس کے بعد اپنے سر کو آسمان کی طرف بلند کر کے فرمایا:

"اللّٰھم وال من والاہ و عاد من عاداہ واحب من احبہ، وابغض من ابغضہ، وانصر من نصرہ، واخذل من خذلہ، وادار الحق معہ حیث دار"

"خداوندا! اس کے دوستوں کو دوست رکھ اور س کے دشمنوں سے دشمن رکھ، جو شخص اسے محبوب رکھے اسے محبوب رکھ اور اس شخص سے بغض رکھ جس کے دل میں اس کا بغض ہو، اس کے دوستوں کی یاری فرما اور اس کا ساتھ چھوڑنے والوں کو محروم فرما، حق کو اس کے ساتھ پھیر جدھر وہ پھرے"

اس کے بعد فرمایا:

"تمام حاضرین اس خبر کو ان لوگوں تک پہنچائیں جو اس وقت یہاں پر حاضر نہیں ہیں۔"

ابھی لوگ متفرق نہیں ہوئے تھے کہ جبرئیل امین وحی الٰہی لے کر نازل ہوئے اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے یہ آیہ شریفہ لے آئے اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (سورہ مائدہ/ ۳))

"آج میں نے تمھارے لئے تمھارے دین کو کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمتوں کو تم پر تمام کر دیا ہے"

اس موقع پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اکبر ،اللہ اکبر ،علی اکمال الدین واتمام النعمۃ ورضی الرب برسالتی والولایۃ لعلی من بعدی۔"

"خدا کی بزرگی کا اعلان کرتا ہوں، خدا کی بزرگی کا اعلان کرتا ہوں، اس لئے کہ اس نے اپنے دین کو کامل اور اپنی نعمت کو ہم پر تمام کر دیا ہے اور میری رسالت اور میرے بعد علیؑ کی ولایت سے راضی ہونے کا اعلان فرمایا ہے۔"

اس وقت لوگوں میں شور وغوغا بلند ہوا، لوگ حضرت علیؑ کو اس مرتبہ کی مبارک باد دے رہے تھے ، یہاں تک کہ ابوبکر اور عمر نے لوگوں کے اجتماع میں علیؑ سے مخاطب ہوکر یہ جملہ کہا:

"بخ بخ لك يابن ابيطالب اصبحت و امسيت مولاى ومولا كل مؤمن ومؤ منة"

"مبارک ہو آپ کو، مبارک ہو آپ کو، اے فرزند ابیطالب آپ میرے اور تمام مومنین و مومنات کے مولا اور رہبر ہوگئے ہیں۔

مذکورہ بالا حدیث کو علمائے اسلام کی ایک بڑی تعداد نے مختلف عبارتوں میں، کہیں مفصل اور کہیں خلاصہ کے طور پر اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ یہ حدیث متواتر احادیث میں سے ہے اور کوئی بھی شخص اس کے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہونے پر شک وشبہہ نہیں کرسکتا ہے، یہاں تک کہ مصنف و محقق "علامہ امینی" نے اپنی مشہور کتاب "الغدیر" میں اس حدیث کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک سو دس اصحاب اور تین سو ساٹھ اسلامی علماء کی کتابوں سے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث اہل سنت بھائیوں کی اکثر تفسیر وتاریخ اور حدیث کی کتابوں میں درج ہے، یہاں تک کہ علمائے اسلام کی ایک بڑی تعداد نے اس حدیث کے سلسلہ میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ مرحوم علامہ امینی نے اس سلسلہ میں ایک گرانقدر اور بے نظیر مستقل کتاب لکھی ہے اور اس میں چھبیس ایسے علمائے اسلام کے نام درج کئے ہیں جنہوں نے "حدیث غدیر" کے متعلق مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

بعض اشخاص نے حدیث کی سند کو ناقابل انکار پاتے ہوئے اس کی امامت وخلافت پر دلالت کے بارے میں شک وشبہہ ایجاد کرنے کی کوشش کی ہے، اور مولا کے معنی کو "دوست" کے عنوان سے جھوٹی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے، جبکہ حدیث کے مضمون، زمان ومکان کے شرائط اور دوسرے قرائن پر غور کرنے سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ "مولا" کا مقصد، بمعنی مکمل رہبری و قیادت اور مسئلہ امامت وولایت کے علاوہ کچھ نہیں ہے:

الف: آیہ تبلیغ جس کا ہم نے گزشتہ سبق میں ذکر کیا، اس واقعہ سے پہلے نازل ہوئی ہے۔ اس میں موجود تند وسخت لہجہ اور قرائن اس بات کی بخوبی گواہی دیتے ہیں کہ یہ عام دوستی اور رفاقت کی بات نہیں ہے ، کیونکہ یہ امر پریشان کن نہیں تھا اور اس کے لئے اتنی اہمیت اور تاکید کی ضرورت نہیں تھی۔ اسی طرح اس

واقعہ کے بعد نازل ہونے والی آیہ "اکمال الدین" اس امر کی گواہ ہے کہ یہ مسئلہ ایک غیر معمولی مسئلہ تھا اور رہبری و پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے علاوہ کوئی اور مسئلہ نہیں تھا۔

ب۔اس حدیث کا ان تمام مقدمات کے ساتھ اس تپتے ہوئے بیان میں ایک تفصیلی خطبہ کے بعد بیان کیا جانا اور اس حساس زمان و مکان میں لوگوں سے اقرار لینا یہ سب ہمارے دعویٰ کی مستحکم دلیل ہے۔

ج۔مختلف گرہوں اور شخصیتوں کی طرف سے حضرت علیؑ کو مبارک باد دینے کے علاوہ اس سلسلہ میں اسی روز اور اس کے بعد کہے گئے اشعار، اس حقیقت کے گویا ہیں کہ یہ مسئلہ علی علیہ السلام کی امامت و ولایت کے بلند منصب پر منصوب ہونے سے مربوط تھا نہ کسی اور چیز سے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔داستان غدیر کو بیان کیجئے۔

۲۔"حدیث غدیر" پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنے اسناد سے اور کتنی اسلامی کتابوں میں نقل ہوئی ہے؟

۳۔"حدیث غدیر" میں "مولا" کیوں "رہبر و امام" کے معنی میں ہے اور دوست کے معنی میں کیوں نہیں ہے؟

۴۔غدیر کے واقعہ کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کے حق میں کون سی دعا کی؟

۵۔"غدیر" اور "جحفہ" کہاں پر ہیں؟

ساتواں سبق

حدیث "منزلت" اور حدیث "یوم الدار"

بہت سے عظیم شیعہ وسنی مفسرین نے حدیث "منزلت" کو سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۱۴۲ کے ذیل میں نقل کیا ہے۔اس آیہ شریفہ میں حضرت موسیٰؑ کے چالیس راتوں کے لئے کوہ طور پر جانے اور اپنی جگہ پر ہارون کو جانشین مقرر کرنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

حدیث یوں ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر دی گئی کہ مشرقی روم کے بادشاہ نے حجاز، مکہ اور مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے ایک بڑی فوج کو آمادہ کیا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامی انقلاب کو اپنے خاص انسانی اور حریت و استقلال کے نظام کے ساتھ اس علاقہ میں پہنچنے سے پہلے ہی ،نابود کر دیا جائے ۔پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مدینہ میں حضرت علیؑ کو اپنا جانشین مقرر فرما کر ایک عظیم لشکر کے ہمراہ تبوک کی طرف روانہ ہو گئے (تبوک جزیرہ عرب کے شمال میں مشرقی روم کی سلطنت کی سرحد پر واقع تھا)

حضرت علیؑ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی خدمت میں عرض کی: کیا مجھے بچوں اور عورتوں کے درمیان چھوڑ رہے ہیں؟ (اور اس بات کی اجازت نہیں دے رہے ہیں کہ آپکے ہمراہ میدان جہاد میں چل کر اس عظیم افتخار کو حاصل کروں؟)۔

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"الاترضی ان تکون منّی بمنزلة هارون من موسی الا انّه لیس نبی بعدی؟"

"کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تمھاری مجھ سے وہی نسبت ہو جو ہارونؑ کی موسیٰؑ سے تھی صرف یہ کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں آئے گا؟"

مذکورہ عبارت اہل سنت کی مشہور ترین حدیث کی کتابوں ،یعنی صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں نقل ہوئی

ہے ،صرف اس فرق کے ساتھ کہ صحیح بخاری میں پوری حدیث درج ہے اور صحیح مسلم میں ایک مرتبہ پوری حدیث اور دوسرے مرتبہ صرف جملہ "انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الّا انّہ لا نبی بعدی" ایک کلی اور تمام جملہ کی صورت میں نقل کی گئی ہے۔(۱)

اس کے علاوہ یہ حدیث اہل سنت کی دوسری کتابوں ،جیسے:"سنن ابن ماجہ"،"سنن ترمذی" اور بہت سی دوسری کتابوں میں نقل کی گئی ہے اور اصحاب رسول پر مشتمل اس حدیث کے راویوں کی تعداد بیس افراد سے زیادہ ہے،جن میں جابر بن عبداللہ انصاری،ابوسعید خدری،عبداللہ بن مسعود اور معاویہ بھی شامل ہیں۔

ابوبکر بغدادی نے" تاریخ بغداد" میں عمر بن خطاب سے یوں نقل کیا ہے:عمر بن خطاب نے ایک شخص کو حضرت علیؑ کے خلاف برا بھلا کہتے ہوئے دیکھا،عمر نے اس شخص سے کہا:مجھے لگتا ہے کہ تم منافق ہو، کیونکہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے

۱۔صحیح بخاری ج۶،ص ۳۔صحیح مسلم ج۱،ص ۴۴۔اور ج۴،ص ۱۸۷۔

کہ آپ فرماتے تھے:

"انّما علیّ منّی بمنزلة هارون من موسی علیہ السلام الّا انه لا نبیّ بعدی"

(تاریخ بغداد،ج۷،ص ۴۵۲)

"علی علیہ السلام کی نسبت مجھ سے ویسی ہی ہے جیسی ہارون کی موسیٰؑ سے تھی صرف یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔"

قابل توجہ بات ہے کہ احادیث کے معتبر منابع و مآخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات (حدیث منزلت) صرف جنگ تبوک کے موقع پر ہی نہیں فرمائی ہے بلکہ درج ذیل سات مواقع پر بیان فرمائی ہے جو اس کے عام اور واضح مفہوم کی دلیل ہے:

۱۔" مکہ کے پہلے مواخات کے دن"۔یعنی جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ میں اپنے اصحاب سے برادری اور اخوت کا عہد و پیمان باندھا،اس موقع پر آپ نے یہی جملہ تکرار فرمایا۔

۲۔"مواخات کے دوسرے دن"۔جب (مدینہ منورہ میں) مہاجر و انصار کے درمیان برادری و اخوت کا عہد و پیمان باندھا تو اس موقع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیث منزلت کو دوسری بار بیان فرمایا۔

۳۔جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ مسجد نبوی کی طرف کھلنے والے گھروں کے تمام دروازے بند کردیئے جائیں اور صرف حضرت علیؑ کے گھر کا دروازہ کھلا رہے، تو آپ نے اس پر بھی اس جملہ (حدیث منزلت) کو دھرایا۔

۴،۵،۶ و ۷۔اسی طرح غزوہ تبوک کے دن اور اس کے علاوہ تین اور مواقع پر آنحضرت نے اس حدیث کو دھرایا ہے کہ ان کے مدارک اہل سنت کی تمام کتابوں میں ذکر ہوئے ہیں، لہذا نہ سند کے لحاظ سے اس حدیث کے بارے میں کوئی شک وشبہہ باقی رہتا ہے اور نہ اس کے عام مفہوم (دلیل) مفہوم ہونے کے لحاظ سے۔

حدیث منزلت کا مفہوم

اگر ہم اپنے ذاتی نظریات سے ہٹ کر، غیر جانبدارانہ طور پر مذکورہ حدیث پر تحقیق وتجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ حضرت ہارون کو جو تمام مناسب اور عہدے بنی اسرائیل میں حاصل تھے، حضرت علی علیہ السلام بھی صرف نبوت کے علاوہ ان تمام عہدوں پر فائز تھے، کیونکہ اس حدیث میں نبوت کے عہدے کے علاوہ کوئی اور قید وشرط موجود نہیں ہے۔

اس لئے یہ نتیجہ نکلتا ہے:

۱۔علیؑ امت میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل تھے۔(کیونکہ ہارون کا مرتبہ بھی ایسا ہی تھا)۔

۲۔علیؑ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وزیر، خاص نائب اور رہبری میں آپ کے شریک تھے، کیونکہ قرآن مجید نے حضرت ہارون کے لئے یہ تمام منصب اور عہدے ثابت کئے ہیں۔(سورہ طہ، آیت ۲۹ سے ۳۲ تک)

۳۔علیؑ، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین اور خلیفہ تھے، آپؐ کے ہوتے ہوئے کوئی دوسرا شخص اس عہدہ پر فائز نہیں ہوسکتا تھا، کیونکہ حضرت موسیٰؑ کی نسبت حضرت ہارونؑ بھی یہی مقام و منزلت رکھتے تھے۔

حدیث "یوم الدار"

اسلامی تواریخ کے مطابق پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعثت کے تیسرے سال خدا کی طرف سے امر ہوا کہ اپنی خفیہ دعوت اسلام کو آشکار فرمائیں، چنانچہ سورہ شعراء کی آیت نمبر ۲۱۴ میں ارشاد ہوا ہے:

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿۲۱۴﴾

"اور پیغمبر! آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیے۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قریبی رشتہ داروں کو اپنے چچا حضرت ابوطالبؑ کے گھر میں کھانے کی دعوت دی، کھانا کھانے کے بعد فرمایا:

"اے عبدالمطلب کے فرزندو! خدا کی قسم عرب میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو اپنی قوم کے لئے مجھ سے بہتر کوئی چیز لایا ہو، میں تمھارے لئے دنیا وآخرت کی نیکیاں لایا ہوں اور خداوند متعال نے مجھے حکم دیا ہے کہ تم لوگوں کو اس دین (اسلام) کی طرف دعوت دوں، تم میں سے کون (اس کام میں) میری مدد کرے گا تا کہ وہ میرا بھائی، وصی اور جانشین بن جائے"؟

سوائے علی علیہ السلام کے کسی بھی شخص نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعوت پر لبیک نہیں کہی۔ حضرت علیؑ ان میں سب سے کم سن تھے، اٹھے اور عرض کی: "اے رسول خدا! میں اس راہ میں آپ کا یار و یاور رہوں۔" پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کی گردن پر اپنا دست مبارک رکھ کر فرمایا:

"ان هٰذا اخی ووصی وخلیفی فیکم فاسمعوا له واطیعوه"

"یہ تم لوگوں میں میرا بھائی، وصی اور جانشین ہے، اس کی بات سنو اور اس کے حکم کی اطاعت کرو۔"

لیکن اس گمراہ قوم (قریش) نے نہ فقط پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ آپ کا مذاق بھی اڑایا۔

مذکورہ حدیث جو کہ حدیث "یوم الدار" روز دعوت ذوالعشیر ہ کے نام سے مشہور ہے، کافی حد تک واضح اور گویا ہے۔ اور سند کے ساتھ بہت سے اہل سنت علماء، جیسے: ابن ابی جریر، ابن ابی حاتم، ابن

مردویہ، ابونعیم، بیہقی، ثعلبی، طبری، ابن اثیر، ابوالفدا اور دوسرے لوگوں نے اسے نقل کیا ہے۔(۱)

اگر ہم مذکورہ حدیث کے بارے میں بھی غیر جانبدارانہ طور پر تحقیق وتجزیہ کرین گے تو حضرت علیؑ کی ولایت وخلافت سے مربوط حقائق بالکل واضح ہو جائیں گے کیونکہ اس حدیث میں بھی مسئلہ خلافت و ولایت کے بارے میں صراحت سے ذکر کیا گیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔مزید تفصیلات کے لئے کتاب" المراجعات"،ص ۱۳۰ سے الخ اور کتاب "احقاق الحق"، ج ۴،ص ۶۲ الخ کی طرف رجوع کیا جائے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔حدیث "منزلت" کیا ہے؟ اور یہ حدیث کتنے مواقع پر بیان کی گئی ہے؟

۲۔حدیث "منزلت" کا مفہوم حضرت علیؑ کے لئے کون سے منصب اور عہدے ثابت کرتا ہے؟

۳۔قرآن مجید کی روشنی میں حضرت ہارونؑ کو حضرت موسیٰؑ کی نسبت کون سا مرتبہ حاصل تھا؟

۴۔حدیث "منزلت" کو کن علماء نے نقل کیا ہے؟

۵۔حدیث "یوم الدار"، اس کا مفہوم، سند اور اس کا نتیجہ بیان کریں۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

آٹھواں سبق: حدیث "ثقلین" اور حدیث "سفینہ"

حدیث ثقلین کے اسناد

اس حدیث کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی ایک بڑی جماعت نے بلا واسطہ (براہ راست) آنحضرت سے نقل کیا ہے بعض بزرگ علماء نے اس حدیث کی روایت کرنے والے اصحاب کی تعداد تیس سے زیادہ بتائی ہے۔ ۱)

مفسرین، محدثین اور مورخین کے ایک بڑے گروہ نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ اس طرح اس حدیث کے متواتر ہونے میں کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہتا ہے۔

بزرگ عالم سید ہاشم بحرانی نے اپنی کتاب "غایۃ المرام" میں اس حدیث کو اہل سنت علماء کے ۳۹ اسناد اور شیعہ علماء کے ۸۰ اسناد سے نقل کیا ہے۔ اور عالم بزرگوار میر حامد حسینؒ ہندی نے اس حدیث کے بارے میں مزید تحقیقات انجام دی ہیں اور تقریباً دوسو اہل سنت علماء سے یہ حدیث نقل کی ہے اور اس حدیث کے سلسلہ میں تحقیقات کو اپنی عظیم کتاب (احقاق الحق) کی چھ جلدوں میں جمع کیا ہے۔

جن مشہور اصحاب نے اس حدیث کو نقل کیا ہے، ان میں: ابوسعید خدری، ابوذر غفاری، زید بن ارقم، زید بن ثابت، ابورافع، جبیر بن مطعم، یا خذیفہ، ضمرہ اسلمی، جابر بن عبداللہ انصاری اور ام سلمہ قابل ذکر ہیں۔ حضرت ابوذر غفاری کے بیان کے مطابق اصل حدیث یوں ہے: ابوذر غفاری اس حال میں کہ خانہ کعبہ کے دروازے کو پکڑے ہوئے تھے، لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بیان کر رہے تھے: میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سے سنا کہ آپ فرماتے تھے:

إنی تارك فیکم الثقلین کتاب الله وعترتی وانهما لن تفترقا حتی یرد اعلی الحوض (جامع ترمذی، طبق نقل ینابیع المودۃ، ص ۳۷)

"میں تمھارے درمیان دو یادگار گرانقدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، قرآن مجید اور میرے اہل بیتؑ۔ یہ دونوں ہرگز ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر کے

کنارے میرے پاس پہنچ جائیں، پس تم ان کا خیال رکھنا اور دیکھنا تم میری وصیت کا ان کے بارے میں کس قدر لحاظ رکھتے ہو۔"

یہ روایت اہل سنت کے معتبر ترین مآخذ، جیسے "صحیح ترمذی"، "نسائی"، "مسند احمد"، کنز العمال" اور" مستدرک حاکم" وغیرہ میں نقل ہوئی ہے۔

بہت سی روایتوں میں "ثقلین" (دوگرانقدر چیزیں) کی تعبیر اور بعض روایات میں "خلیفتین" (دوجانشین) کی تعبیر آئی ہے۔ مفہوم کے اعتبار سے ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو مختلف مواقع پر لوگوں کے سامنے بیان فرمایا ہے:

"جابر بن عبداللہ انصاری" کی روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت نے سفر حج کے دوران عرفہ کے دن اس حدیث (ثقلین) کو بیان فرمایا۔

"عبداللہ بن خطب" کی روایت میں آیا ہے کہ آنحضرت نے اس حدیث کو سرزمین جحفہ (جو مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ ہے جہاں سے بعض حجاج احرام باندھتے ہیں) میں بیان فرمایا ہے۔

"ام سلمہ" روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت نے اس حدیث کو غدیر خم میں بیان فرمایا۔

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بستر علالت پر بیان فرمایا ہے۔

ایک روایت میں آیا ہے کہ آپ نے یہ حدیث مدینہ منورہ میں منبر پر بیان فرمائی ہے(۱)۔

حتی اہل سنت کے ایک مشہور عالم "ابن حجر" اپنی کتاب "صواعق المحرقہ" میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حدیث کو بیان فرمانے کے بعد حضرت علیؑ کے ہاتھ کو پکڑ انھیں بلند کیا اور فرمایا: "یہ علیؑ قرآن کے ساتھ ہے اور قرآن علیؑ کے ساتھ ہے، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوض کوثر کے پاس مجھ سے ملیں گے(2)۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس مسئلہ پر ایک بنیادی اصول کی حیثیت سے بار بار تاکید فرمائی ہے اور اس قطعی حقیقت کو بیان کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا

ہے تا کہ اسے کبھی فراموش نہ کیا جائے۔

حدیث ثقلین کا مفہوم

یہاں پر چند نکات قابل توجہ ہیں:

ا۔قرآن اورعترت (اہل بیت) کو پیغمبر اسلام کی طرف سے دو "خلیفہ" یا دو گرانقدر چیزوں کے عنوان سے پیش کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز ان دو چیزوں کا دامن نہیں چھوڑنا چاہئے ،بالخصوص اس قید وشرط کے ساتھ جو بہت سی روایتوں میں مذکور ہے:"اگر ان دو چیزوں کا دامن نہ چھوڑو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے"اس سے یہ حقیقت تاکیداً ثابت ہوتی ہے۔

۲۔قرآن مجید کا عترت کے ساتھ اورعترت کا قرآن مجید کے ساتھ قرار پانا اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح قرآن مجید ہر قسم کے انحراف اور خطا سے محفوظ ہے،اسی طرح عترت اور اہل بیت پیغمبر بھی مرتبہ عصمت کے مالک ہیں۔

۳۔ان بعض روایتوں میں پیغمبر اسلام نے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صراحت سے

ا۔الصواعق المحرقہ،ص ۷۵

فرمایا ہے: میں قیامت کے دن تم سے ان دو یادگاروں کے ساتھ کئے گئے تمھارے برتاؤ کے بارے میں باز پرس کرونگا تا کہ دیکھ لو کہ تمھاراان کے ساتھ کیسا سلوک رہا ہے؟

۴۔بلا شک شبہہ،ہم "عترت واہل بیت" کی جس طرح بھی تفسیر وتوضیح کریں،حضرت علیؑ ان کے نمایاں ترین مصداق ہیں۔اور متعدد روایات کے مطابق آپؑ کبھی قرآن مجید سے جدا نہیں ہوئے ہیں اور قرآن مجید بھی آپؑ سے جدا نہیں ہوا ہے۔

اس کے علاوہ متعدد روایتوں میں آیا ہے کہ آیہ "مباہلہ" کے نازل ہونے کے وقت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی،فاطمہ حسن اور حسین (علیہم السلام) کو پکار کر فرمایا:"یہ میرے اہل بیت ہیں۔"(3)

۵۔اگر چہ اس دنیا کی چار دیواری میں مقیّد ہم لوگوں کے لئے قیامت سے متعلق مسائل پوری طرح واضح نہیں ہیں،لیکن جیسا کہ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے "حوض کوثر" سے مراد بہشت میں موجود ایک خاص نہر ہے جس کے بہت سے خصوصیات ہیں،اور یہ نہر سچے مومنین ،پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے ائمہ اہل بیتؑ اور ان کے مکتب کے پیروؤں کے لئے مخصوص ہے۔

یہاں تک کی گئی ہماری گفتگو سے واضح ہوتا ہے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کے رہبر وقائد حضرت علی علیہ السلام ہیں اور آپؑ کے بعد آپ ہی کی نسل سے گیارہ ائمہ ہیں۔

حدیث سفینہ

اہل سنت اور شیعوں کی کتابوں میں جو دلکش تعبیریں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہےں، ان میں سے ایک مشہور حدیث "سفینہ نوح" ہے۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ پیغمبر نے یوں فرمایا:

ا'لا إن مثل اهل بيتي فيكم مثل سفينة نوح من ركبها نجي ومن تخلف عنها غرق

"میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح جیسی ہے جو اس میں سوار ہوا نجات پا گیا اور جو اس سے جدا ہوا وہ غرق (ہلاک) ہو گیا۔" (مستدرک حاکم، ج۳، ص۱۵۱)

یہ مشہور حدیث بھی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد لوگوں کو حضرت علی علیہ السلام اور اہل بیت پیغمبر کی پیروی واطاعت کو ضروری اور لازم قرار دیتی ہے۔

چونکہ ایسی عظیم اور عالمگیر طوفان کے وقت صرف حضرت نوح کی کشتی نجات کا ذریعہ تھی، اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی رحلت کے بعد امت مسلمہ میں رونما ہونے والے گمراہی کے طوفان میں راہ نجات صرف ولایت اہل بیت سے تمسک رکھنا تھا اور ہے۔

حوالہ جات

۱۔سیرہ حلی ج ۳۳، ص ۳۰۸۔

2۔المراجعات، ص ۴۲

3۔مشکوۃ المصابیح، ص ۵۶۸ (طبع دہلی) ریاض المنضرہ، ج ۲، ص ۲۴۸ (بحوالہ مسلم وترمذی)۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔حدیث ثقلین کا مفہوم کیا ہے؟ اور یہ حدیث اہل بیتؑ کے لئے کون سے امتیازات وخصوصیات ثابت کرتی ہے؟

۲۔حدیث ثقلین کو کن لوگوں نے نقل کیا ہے؟

۳۔"ثقلین" کے کیا معنی ہیں؟ کیا احادیث میں اس کی بجائے کوئی دوسری تعبیر بھی ذکر ہوئی ہے؟

۴۔حدیث "ثقلین" کو پیغمبر اسلام نے کن مواقع پر بیان فرمایا ہے؟

۵۔حدیث "سفینہ" کو سند اور مفہوم کے اعتبار سے بیان کیجئے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نواں سبق: بارہ امامؑ

بارہ اماموں کے بارے میں روایات

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی بلافصل خلافت وامامت کو ثابت کرنے کے بعد اب ہم باقی اماموں کی امامت کے بارے میں بحث کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہے:

آج ہمارے پاس اہل سنت اور اہل تشیّع کی متعدد ایسی روایتیں موجود ہیں جو کلی طور پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد" بارہ خلفاء اور ائمہ" کی خلافت کو ثابت کرتی ہیں۔

یہ احادیث اہل سنت کی نہایت اہم اور مشہور کتابوں، جیسے: صحیح بخاری، صحیح ترمذی، صحیح مسلم، صحیح ابی داؤد اور مسند احمد وغیرہ میں درج ہیں۔

کتاب "منتخب الاثر" کے مصنف نے اس موضوع پر دوسوا کتھر احادیث جمع کی ہیں جن کی قابل توجہ تعداد اہل تسنن علماء کی کتابوں سے اور باقی شیعوں کی کتابوں سے نقل کی گئی ہیں۔

مثال کے طور پر، اہل سنت کی مشہورترین کتاب صحیح بخاری میں اس سلسلہ یوں آیا ہے:

"جابر بن سمرۃ" کہتا ہے کہ میں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا:

"یکون اثنا عشر امیراً۔ فقال کلمۃ لم اسمعھا فقال ابی انه قال۔ کلھم من قریش۔" (صحیح بخاری، ج۹، کتاب الامقام، ص۱۰۰)

"میرے بعد بارہ امیر ہوں گے۔اس کے بعد ایک جملہ فرمایا کہ میں سن نہ سکا۔میرے باپ نے کہا کہ پیغمبر نے فرمایا تھا:" وہ سب قریش میں سے ہیں"

"صحیح مسلم" میں اس حدیث کو یوں نقل کیا گیا ہے کہ" جابرؓ" نے کہا: میں نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ آپ نے فرمایا:

"لایزال الاسلام عزیزاًالی اثنا عشر خلیفۃ ثم قال کلمۃ لم افھمھا،فقلت لابی ماقال فقال کلھم من قریش" (صحیح مسلم، کتاب الامارہ

،باب الناس تبع لقریش)

"اسلام ہمیشہ عزیز رہے گا یہاں تک کہ میرے بارہ خلیفہ وجانشین ہوں گے۔اس کے بعد ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ میں نہ سن سکا۔میں نے اپنے باپ سے سوال کیا،تو انہوں نے کہا پیغمبر نے فرمایا:"وہ سب قریش ہوں گے۔"

کتاب"مسند احمد"میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مشہور صحابی عبداللہ بن مسعود سے نقل کیا گیاہے کہ لوگوں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ کے خلفائ

کے بارے میں سوال کیا۔تو آپنے فرمایا:

"اثنا عشر کعدۃ نقباء بنی اسرائیل" (مسند احمد،ج۱ص۳۹۸)

"(میرے خلفاء)بنی اسرائیل کے نقبا ؤرؤسا کی تعداد کے برابر بارہ ہوں گے۔"

ان احادیث کامفہوم

ان احادیث میں سے بعض میں"اسلام کی عزت" کا دارومدار بارہ خلیفوں پر قرار دیا گیا ہے اور بعض میں قیامت کے دن کی بقاء اور حیات کو بارہ خلفاء کا مرہون منت جانا ہے۔سب کو قریش سے اور بعض احادیث میں سب کو خاندان"بنی ہاشم" سے بتایا گیا ہے۔یہ احادیث مذاہب اسلامی میں سے مذہب شیعہ کے علاوہ کسی مذہب سے تطبیق نہیں کرتی ہیں،کیونکہ شیعوں کے عقیدہ کے مطابق ان کی توجیہ مکمل طور پر بالکل صحیح اور واضح ہے،جبکہ اہل سنت علماء کے پاس ان کی توجیہ کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

کیاان(بارہ خلفاء)سے مراد پہلے چار خلفاء اور خلفائے بنی امیہ و بنی عباس ہیں؟

جبکہ ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ نہ پہلے خلفاء کی تعداد بارہ تھی اور نہ بنی امیہ کے خلفاء کو ملا کر بارہ بنتی ہے نہ خلفائے بنی عباس کو ملا کر یہ تعداد بارہ بنتی ہے۔مختصر یہ کہ کسی بھی حساب سے بارہ کی یہ تعداد پوری نہیں ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ بنی امیہ کے خلفاء میں"یزید"جیسے اور خلفائے بنی عباس میں"منصور دوانقی"اور "ہارون الرشید"جیسے افراد بھی تھے جن کے ظالم اور جابر ہونے میں کسی کو شک وشبہہ نہیں ہے،اس لئے ممکن نہیں ہے ایسے افراد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء اور اسلام کی عزت وسربلندی کا سبب شمار ہوں،جس قدر بھی ہم خلافت کے معیار کو گھٹائیں،ایسے افراد قطعاً اس دائرے میں نہیں آسکتے ہیں۔

اس بحث سے قطع نظر، شیعوں کے بارہ اماموں کے علاوہ کسی صورت میں بارہ خلفاء کی تعداد کہیں بھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔

بہتر ہے کہ اس بحث کو ہم اہل سنت کے ایک مشہور عالم کی زبانی پیش کریں:

"**سلیمان بن ابراهیم قندوزی حنفی**" اپنی کتاب "ینابیع المودۃ" میں فرماتے ہیں:

بعض محققین نے کہا ہے: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے بارہ خلفاء پر دلالت کرنے والی احادیث مشہور ہیں۔ یہ احادیث مختلف طریقوں سے نقل کی گئی ہیں۔ مرور زمانہ سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے وہ یہ ہے کہ اس حدیث سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مراد آپ کے اہل بیت اور عترت سے بارہ جانشین ہیں، کیونکہ اس حدیث کو پہلے خلفاء سے مربوط جاننا ممکن نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد چار افراد سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ حدیث بنی امیہ پر بھی تطبیق نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ بارہ سے زیادہ تھے اور وہ عمر بن عبدالعزیز کے علاوہ سب ظالم وستمگر تھے اور یہ کہ وہ "بنی ہاشم" سے نہیں تھے، جبکہ پیغمبر نے فرمایا ہے کہ وہ بارہ کے بارہ بنی ہاشم سے ہیں، جیسا کہ "عبدالملک بن عمر" نے "جابر بن سحرہ" سے نقل کیا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اس سوال کے سلسلہ میں کہ وہ (بارہ جانشین) کسی قبیلہ سے ہوں گے؟ آہستہ جواب دینا اس بات کی دلیل ہے کہ بنی ہاشم کی خلافت پر بعض افراد راضی نہیں تھے۔ اسی طرح یہ حدیث خلفائے بنی عباس پر بھی قابل تطبیق نہیں ہے، کیونکہ ان کی تعداد بھی بارہ سے زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے آیہ مودت "قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى" (سورہ شوریٰ/ ۲۳) پر عمل نہیں کیا ہے اور حدیث کساء سے چشم پوشی کی ہے!

ان وجوہات کی بناء پر یہ حدیث صرف پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت وعترت سے تعلق رکھنے والے بارہ اماموں پر ہی قابل تطبیق ہے۔

کیونکہ وہ علم ودانش کے اعتبار سے سب پر فضیلت رکھتے ہیں، اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے بھی سب سے زیادہ زاہد و پرہیزگار ہیں، اور حسب ونسب کے اعتبار سے بھی سب پر فضیلت رکھتے ہیں اور انہوں نے تمام علوم وفنون کو اپنے جد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وراثت میں حاصل کیا ہے۔ اس نظریہ کی حدیث ثقلین اور دوسری بہت سی احادیث تائید کرتی ہیں جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل ہوئی ہیں۔" (ینابیع المودۃ، ص ۴۴۶)

دلچسپ بات ہے کہ میں نے اپنے سفر مکہ کے دوران علماء حجاز کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کے دوران اس حدیث کے بارے میں ان سے ایک نئی توجیہ سنی، جس سے ان کی اس سلسلہ میں بے بسی اور عاجزی واضح ہوتی ہے، وہ کہتے تھے: "شاید بارہ خلفاء اور امراء سے مراد پہلے چار خلیفہ ہیں جو اسلام کی ابتداء میں تھے اور ان کے باقی افراد مستقبل میں آنے والے ہیں جنہوں نے ابھی ظہور نہیں کیا ہے!"

اس طرح، پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے واضح ہونے والے ان خلفاء کے ارتباط سے دیدہ ودانستہ طور پر چشم پوشی کی گئی ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ ہم اس حدیث کی واضح اور روشن تفسیر (جو شیعوں کے بارہ اماموں پر منطبق ہے) کو چھوڑ کر ایسی دلائل میں کود پڑیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

نام بنام ائمہ کی تعیین

قابل توجہ بات ہے کہ اہل سنت راویوں سے ہم تک پہنچی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض احادیث میں صراحت کے ساتھ بارہ اماموں کے نام ذکر ہوئے ہیں اور ان کی خصوصیات وصفات بھی تفصیل سے ذکر ہوئی ہیں۔

اہل سنت کے معروف اور مشہور عالم "شیخ سلیمان قندوزی" اپنی اسی کتاب "ینابیع المودة" میں یوں نقل کرتے ہیں:

"نعثل نامی ایک یہودی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کئی سوالات کے ضمن میں آپ کے خلفاء اور اوصیاء کے بارے میں سوال کیا۔ آنحضرتؐ نے اپنے جانشینوں کا تعارف یوں کرایا:

ان وصیی علی بن ابیطالب وبعدہ سبطای الحسن والحسین تلوہ تسعة ائمة من صلب الحسین۔ قال یا محمدؐ فسمھم لی۔

قال(ص) اذا مضی الحسین فابنہ علی،فاذا مضی علی فابنہ محمد ،فاذا مضی محمد فابنہ جعفر ،فاذامضی جعفر فابنہ موسی ،فازامضی موسی فابنہ علی،فاذا مضی علی فابنہ محمد، فاذا مضی محمد فابنہ علی، فاذا

مضی علی فابنه الحسن، فاذا مضی الحسن فابنه الحجة محمد المهدی علیه السلام فهٰؤلاء اثنا عشر۔" (ینابیع المودة،ص۴۴۱)

"میرے وصی علی بن ابیطالب ہیں اور ان کے بعد میرے دونواسے حسن اور حسین ہیں اور حسین کے بعد نو امام ان کی نسل سے ہوں گے۔"

یہودی نے کہا: اُن کے نام بیان فرمایئے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

جب حسین دنیا سے رخصت ہوں گے تو اُن کے بیٹے علی ہوں گے، جب علی دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے محمد ہوں گے، جب محمد دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے جعفر ہوں گے، جب جعفر دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے موسیٰ ہوں گے، جب موسیٰ دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے علی ہوں گے، جب علی دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے محمد ہوں گے، جب محمد دنیا سے رخصت ہوں گ تو ان کے بیٹے علی ہوں گے، جب علی اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے حسن ہوں گے،اور جب حسن اس دنیا سے رخصت ہوں گے تو ان کے بیٹے حجت محمد المھدی ہوں گے۔یہ بارہ امام ہیں۔" (ینابیع المودة،ص ۴۴۱)

اس کے علاوہ اسی کتاب "ینابیع المودة" میں "کتاب مناقب" سے نقل کی گئی ایک اور حدیث درج ہے،جس میں بارہ اماموں کے نام اور ان کے القاب بھی بیان کئے گئے ہیں اور حضرت مھدی کی غیبت،اور اس کے بعد ان کے قیام کر کے دنیا کو عدل وانصاف سے اسی طرح پر کرنے کا ذکر کیا گیا ہے جس طرح دنیا اس سے پہلے ظلم وستم سے بھر گئی ہوگی۔(ینابیع المودة،ص ۴۴۲)

البتہ اس سلسلہ میں شیعوں کی احادیث بہت زیادہ اور حد تواتر سے بڑھ کر موجود ہیں۔(غور فرمایئے)۔

جو شخص اپنے زمانہ کے امام کو پہچانے بغیر مر جائے

دلچسپ بات ہے کہ اہل سنت کی کتابوں میں ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کی گئی ایک حدیث میں آیا ہے:

"من مات بغیر امام مات میتتة جاهلیة"

(المعجم المفہرس لالفاظ الاحادیث النبوی،ج۶،ص ۳۰۲)

"جوشخص امام کے بغیر مرجائے، اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔"

شیعہ کتابوں میں یہی حدیث اس عبارت میں نقل ہوئی ہے:

"من مات ولا یعرف امامه مات میتته جاهلته"

"جوشخص مرگیا اور اس نے اپنے امام کونہیں پہچانا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔" (بحارالانوار ج٦، (طبع قدیم) ص١٦)

یہ حدیث اس بات کی گواہ ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے، اس کو پہچاننا ضروری ہے۔ اس کو نہ پہچاننا اتنا نقصان دہ ہے کہ انسان کفر و جاہلیت کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے۔

کیا اس حدیث میں بیان کئے گئے امام و پیشوا سے مراد وہی لوگ ہیں جو زمام حکومت سنبھالتے ہیں، جیسے، چنگیز خان، ہارون اور دوسروں کے ایجنٹ اور کٹھ پتلی حکام؟

بے شک اس سوال کا جواب منفی ہے، کیونکہ اکثر حکمران غیر صالح، ظالم اور کبھی مشرق و مغرب کی طاقتوں سے وابستہ اور اغیار کی سیاست کے آلہ کار ہوتے ہیں، یقیناً ایسے حکمرانوں کو امام کی حیثیت سے قبول کرنا انسان کو جہنم میں بھیج دیتا ہے۔

لہذا واضح ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے میں ایک معصوم امام موجود ہوتا ہے لوگوں کے لئے اس کو تلاش کر کے اس کی رہبری کو قبول کرنا ضروری ہے۔

البتہ ہر ایک امام کی امامت کو مذکورہ بالا طریقوں کے علاوہ قرآنی نصوص اور آنے والے امام کے بارے میں ہر سابق امام کی بیان کی گئی احادیث و روایات نیز ان کے معجزات سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

غور کیجئے اور جواب دیجئے

١۔ بارہ اماموں کے بارے میں روایات کن کتابوں میں نقل ہوئی ہے؟

٢۔ ان احادیث کا مفہوم کیا ہے؟

٣۔ ان احادیث اور روایات کے بارے میں کی گئی جھوٹی توجیہات بیان کیجئے۔

٤۔ کیا اہل سنت کی احادیث میں بارہ اماموں کے نام آئے ہیں؟

٥۔ بارہ اماموں کو ثابت کرنے کا دوسرا طریقہ کیا ہے؟

دسواں سبق

حضرت مہدیؑ بارہویں امام اور دنیا کے مصلح اعظم

تاریک شب کا خاتمہ

جب ہم موجودہ حالات پر نظر ڈالتے ہیں اور ظلم وستم قتل وغارت، جنگ وخونریزی، اور بین الاقوامی سطح پر کشمکش، اختلافات اور روزمرہ بڑھتی ہوئی اخلاقی برائیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کیا یہی حالت جاری رہے گی؟ اور ظلم وستم اور برائیوں کا دامن اس قدر وسیع ہوجائے گا کہ انسانی معاشرہ کو ایک دائمی جنگ میں مبتلا کر کے اسے نابود کردے گا؟ یا اعتقادی انحرافات اور اخلاقی برائیاں اسے ایک متعفّن دلدل کے مانند اپنے اندر غرق کرلیں گی؟

یا نجات واصلاح کی کوئی امید موجود ہے؟

اس اہم سوال کے دو جواب ہیں:

پہلا جواب، وہ ہے جو بدبینوں اور مادہ پرستوں کی طرف سے دیا جاتا ہے کہ دنیا کا مستقبل تاریک ہے اور ہر دور وزمان میں زبردست خطرہ کا احتمال موجود ہے۔

دوسرا جواب دین داروں کا ہے، یعنی جو لوگ ادیان الٰہی کے اصولوں کے معتقد ہیں، مخصوصا مسلمان اور بالخصوص شیعہ، وہ اس سوال کا جواب یوں دیتے ہیں:

اس تاریک رات کے پیچھے ایک امید کی صبح بھی ہے۔

یہ سیاہ بادل، مہلک طوفان اور تباہ کن سیلاب ایک دن ختم ہوں گے اور اس کے بعد صاف آسمان، چمکتا سورج اور آرام وآسائش کا ماحول آنے والا ہے۔

یہ خوفناک بھنور ہمارے سامنے نہیں رہیں گے اور جلدی ہی افق پر نجات کا ساحل دکھائی دینے والا ہے۔

دنیا ایک مصلح اعظم کے انتظار میں ہے جو ایک انقلاب کے ذریعہ دنیا کو حق وعدالت سے بھر دے گا۔

البتہ تمام ادیان کے پیرو اس مصلح اعظم کو الگ الگ ناموں سے جانتے ہیں۔ شاعر عرب نے کیا خوب کہا ہے:

عبارتنا شتی و حسنك واحد و كل الى ذالك الجمال يشير

"ہماری تعبیریں مختلف ہیں لیکن آپ کا حسن و زیبائی ایک چیز سے زیادہ نہیں ہے اور ہماری تمام تعبیریں صرف اسی حسن و زیبائی کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔"

فطرت اور مصلح اعظم کا ظہور

باطنی الہامات کہ جن کی امواج بعض اوقات عقلی فیصلوں سے بھی زیادہ قوی ہوتی ہیں، نہ صرف خدا کی معرفت کے مسئلہ میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں بلکہ تمام مذہبی اعتقادات میں ہماری راہنمائی کرتے ہیں اور مصلح اعظم کے ظہور کے مسئلہ میں بھی ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

اس کی علامتیں حسب ذیل ہیں:

پہلی علامت: عالمگیر عدل و انصاف سے عشق و محبت، اس لئے کہ دنیا کے تمام لوگ ہر قسم کے آپسی اختلافات کے باوجود اور بغیر کسی استثناء کے صلح و عدالت سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم سب اس کے لئے فریاد بلند کرتے ہیں اور اس راہ میں کوشش کرتے ہےں اور پوری قوت سے عالمگیر صلح و عدالت کے خواہاں ہیں۔

اس مصلح اعظم کے ظہور کے فطری ہونے کے باری میں اس سے بہتر کوئی اور دلیل ممکن نہیں ہے، کیونکہ ہر جگہ پر ایک کی آرزؤں کا یکساں ہونا ان کے فطری ہونے کی دلیل ہے۔ (غور کیجئے)

ہر حقیقی اور فطری عشق، خارج میں ایک معشوق کے وجود اور اس کی کشش کی علامت ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند متعال نے انسان کے اندر اس پیاس کو پیدا کیا ہو لیکن اس پیاس کو بجھانے کے لئے خارج میں کوئی چشمہ موجود نہ ہو؟

اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ انسان کی عدالت طلب فطرت بلند آواز میں کہہ رہی ہے کہ آخر کار صلح اور عدل و انصاف تمام دنیا میں پھیل جائے گا اور ظلم و ستم اور خود خواہی ختم ہو کر رہے گی اور انسانیت تمام دنیا میں ایک ملک کی حثیت سے ایک پرچم تلے مفاہمت اور پاکیزگی کے ساتھ زندگی بسر کرے گی۔

دوسری علامت: عام طور پر دنیا کے تمام ادیان اور مذاہب میں ایک مصلح اعظم کے انتظار کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ تقریبا تمام مذاہب میں اس موضوع پر ایک دلچسپ بات موجود ہے اور بشریت کے جان

لیوا زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے ایک عظیم نجات دہند کے ظہور کا عقیدہ صرف مسلمانوں میں ہی نہیں ہے، بلکہ اسناد و مدارک سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک عام اور قدیمی اعتقاد ہے جو مشرق و مغرب کے تمام مذاہب میں موجود رہا ہے، اگر چہ اسلام ایک کامل مذہب ہونے کے ناطے اس مسئلہ پر زیادہ تاکید کرتا ہے۔

زرتشتوں کی معروف کتاب "زند" میں "ایزدان" اور "اہریمنان" کے درمیان دائمی جنگ کے سلسلہ میں لکھا گیا ہے: "آخرکار ایزدان کو بڑی کامیابی حاصل ہوگی اور اہریمنان کو وہ نابود کردے گا

"کائنات اپنی اصلی سعادت کو حاصل کرے گی اور انسان نیک بختی کے تخت پر بیٹھ جائے گا۔!"

کتاب "جاماسب نامہ" میں "زرتشت" سے نقل کیا گیا ہے:

"تازیان کی سرزمین سے ایک مرد ظہور کرے گ وہ بڑے سر، بڑے جسم اور بڑی پنڈلیوں والا ایک مرد ہوگا جو اپنے جد کے دین پر ہوگا اور اس کے ساتھ ایک بڑی فوج ہوگی وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے گا۔"

ھندؤں کی کتاب "وشنو جگ" میں یوں آیا ہے:

"سرانجام دنیا ایک ایسے شخص کی طرف پلٹے گی جو خدا کو دوست رکھتا ہوگا اور خدا کے خاص بندوں میں سے ہوگا۔"

ہندؤں کی کتاب "باسک" میں آیا ہے:

"آخری زمانہ میں ایک بادشاہ پر دنیا کا اختتام ہوگا، وہ فرشتوں، جنوں اور انسانوں کا پیشوا ہوگا، حقیقت میں حق اس کے ساتھ ہوگا، جو کچھ سمندروں، دریاؤں، زمینوں اور پہاڑوں میں پوشیدہ ہے، وہ ان سب چیزوں کو حاصل کرے گا۔ جو کچھ آسمان وزمین میں ہے اس کی خبر دے گا اور اس سے بڑی کوئی شخصیت دنیا میں نہیں آئے گی۔"

عہد قدیم (تورات اور اس کے ملحقات) کی کتاب "مزامیر داؤد" میں درج ہے:

"شرپسند لوگ نابود ہوجائیں گے لیکن خدا پر توکل کرنے والے زمین کے وارث ہوجائیں گے۔"

اسی کتاب کی اسی فصل میں آیا ہے:

"سچے لوگ زمین کے وارث ہوکر ہمیشہ کے لئے اس کے ساکن ہوجائیں گے۔"

اسی کے مانند عبارت، کتب تورات سے مربوط "اشعیای نبی" کی کتاب میں بھی آئی ہے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

انجیل "متی" کی ۲۴ویں فصل میں یوں آیا ہے:

"جس طرح بجلی مشرق سے چمک کر مغرب تک پہنچتی ہے،اسی طرح فرزندانسان بھی ظہور کرے گے۔

انجیل "لوقا" کی بارہویں فصل میں بیان ہوا ہے:

" اپنی کمریں کس کے رکھو، اپنے چراغوں کو جلائے رکھو، اوراس شخص کے مانند رہو جو اپنے مالک کے انتظار میں ہوتا ہے تا کہ جوں ہی وہ آجائے اور دروازہ کھٹکھٹائے تو فورااس کے لئے دروازہ کھول دیں!"

کتاب "علائم الظہور" میں یوں آیا ہے:

" چینیوں کی قدیم کتابوں، ہندوؤں کے عقائد، اسکنیڈ ینوی باشندوں،حتی قدیم مصریوں اور میکسیکو کے باشندوں اوران جیسے دوسرے لوگوں میں ایک مصلح اعظم کے ظہور کا عقیدہ پایا جاسکتا ہے۔"

عقلی دلائل

الف۔خلقت کا نظام ہمیں یہ سبق سکھا تا ہے کہ عالم بشریت کے لئے سرانجام عدل وانصاف کے قانون کے سامنے ہتھیار ڈال کرایک عادلانہ نظام اور پائدار مصلح کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ضروری ہے۔

اس بات کی وضاحت یوں ہے: جہاں تک ہمیں علم ہے،کائنات مختلف نظاموں کا ایک مجموعہ ہے ،اس پوری کائنات میں منظم قوانین کا وجوداس نظام کی وحدت اور ہم آہنگی کی دلیل ہے۔

نظم وضبط، قانون اور حساب وکتاب اس کائنات کے بنیادی مسائل میں شمار ہوتے ہیں۔

عظیم اور وسیع نظاموں سے لے کرایک ایٹم کے ایک ذرّے تک (کہ لاکھوں ذرّے ایک سوئی کی نوک پر سما سکتے ہیں)سب کے سب ایک دقیق نظام کے تحت ہیں۔

ہمارے بدن کے مختلف اعضاء ،ایک چھوٹی اور حیرت انگیز خلیہ کی بناوٹ سے لے کر مغز واعصاب، پھیپھڑے اور دل کے کام کرنے کے طریقہ تک،ایک ایسے نظام کے تحت چل رہے ہیں کہ بعض دانشوروں نے ان میں سے ہرایک عضو کوانسان کے بدن میں ایک ایسی صحیح اور دقیق گھڑی سے تشبیہ دی ہے کہ منظم اور پیچیدہ ترین کمپیوٹر بھی اس کے سامنے ناچیز ہے۔

کیا ایسی منظم کائنات میں انسان، جواس "کل" کا ایک "جزو" ہے،ایک ناموافق اور نامنظم حصہ کے مانند، جنگ وخونریزی اور ظلم وستم میں زندگی بسر کرسکتا ہے؟!

کیا بے انصافیاں اور اخلاقی واجتماعی برائیاں، جوایک قسم کی بے نظمی ہیں،انسانی معاشرے پر

ہمیشہ حاکم رہ سکتی ہیں؟

نتیجہ: کائنات کے نظام کا مشاہدہ ہمیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ سرانجام انسانی معاشرہ بھی ایک دن نظم وانصاف کے سامنے سر تسلیم خم کر کے اپنی خلقت کی اصلی راہ کی طرف لوٹے گا۔

ب۔ معاشروں کا ارتقائی سفر، عالم بشریت کے روشن مستقبل کی ایک اور دلیل ہے، کیونکہ ہم اس حقیقت سے ہرگز انکار نہیں کر سکتے ہیں کہ جب سے انسانی معاشرہ نے اپنے آپ کو پہچانا ہے، وہ کبھی ایک جگہ پر رکا نہیں ہے، بلکہ ہمیشہ آگے کی طرف حرکت کرتا رہا ہے۔

مادی لحاظ سے انسان کا گھر، لباس، غذا اور آمدورفت اور حمل ونقل کے ذرائع ایک دن بالکل سادہ اور ابتدائی مرحلہ میں تھے۔ آج یہی چیزیں ترقی کے ایک ایسے مرحلے پر پہنچی ہیں کہ عقلیں متحیر اور آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور ارتقاء کا یہ سفر یقینا جاری ہے۔

انسان، علم ودانش اور تہذیب وتمدن کے لحاظ سے بھی مسلسل ترقی کر رہا ہے اور اس سلسلہ میں ہر روز نئی ایجادات، تحقیق اور نئے مطالب حاصل کر رہا ہے۔

اس "قانون ارتقاء" میں سرانجام معنوی اور اخلاقی واجتماعی پہلو بھی شامل ہیں اور انسانیت کو ایک عادلانہ قانون، پائدار عدل وانصاف، اخلاقی ومعنوی فضائل کی طرف لے جا رہے ہیں۔ اگر آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ معاشروں میں اخلاقی برائیاں روز بروز اضافہ ہوتی جارہی ہیں۔ یہ سلسلہ تدریجاً خود بھی ایک تکاملی انقلاب کے لئے مواقع فراہم کرے گا۔

ہم کبھی نہیں کہتے کہ برائیوں اور فسادوں کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہئے، لیکن یہ ضرور کہتے ہیں کہ جب فساد اور برائیاں حد سے گزر جائیں گی، تو اس کا ردعمل ایک اخلاقی انقلاب ہوگا۔ جب انسان اپنے گناہوں کے نامطلوب عواقب کے نتائج میں بے بس ہوجائیں گے تو اس وقت وہ کم ازکم ایک الٰہی رہبر کی طرف سے پیش کئے جانے والے قانون کو قبول کرنے پر آمادہ ہوجائیں گے۔

قرآن مجید اور ظہور حضرت مہدیؑ

قرآن مجید میں ایسی متعدد آیات موجود ہیں جو حضرت مہدیؑ کے ظہور کی بشارت دیتی ہیں۔ ہم ان آیات میں سے صرف ایک آیت پر اکتفا کرتے ہیں:

سورۂ نور کی آیت نمبر ۵۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ

"اللہ نے تم میں سے صاحبان ایمان و عمل صالح سے وعدہ کیا ہے کہ انھیں روئے زمین میں اسی طرح اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا ہے۔"

اس آیہ شریفہ سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ زمین پر آخر کار ظالم و جابر حکمرانوں کی حکومت ان سے چھین لی جائے گی اور ان کی جگہ پر صالح مؤمن حکومت کریں گے۔

اسی آیت کے آخر میں مذکورہ وعدہ کے علاوہ مندرجہ ذیل تین اور وعدے بھی دئے گئے ہیں:

۱۔ دین کا غلبہ اور دلوں میں اللہ کی حکومت کا معنوی نفوذ:

وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ

"اور ان کے لئے اس دین کو غالب بنائے گا جسے ان کے لئے پسندیدہ قرار دیا ہے۔"

۲۔ ہر قسم کی بدامنی کا امن و امان میں تبدیل ہونا:

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا

"اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا۔"

۳۔ پوری دنیا سے شرک کا خاتمہ ہونا:

يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا

"وہ لوگ صرف میری عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہ کریں گے۔

حضرت امام علی بن الحسین (زین العابدین) نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے:

"هم والله شيعتنا يفعل الله ذٰلك بهم على يدى رجل منا وهو مهدى هذه الامة"

"خدا کی قسم یہ لوگ وہی ہمارے شیعہ ہیں، خداوند متعال ہمارے خاندان کے ایک شخص کے ذریعہ اس موضوع (حکومت الٰہی) کو محقق فرمائے گا اور وہ اس امت کا مہدی ہے" (تفسیر مجمع

النیان، سورہ نور کی آیت ۵۵ کے ذیل میں)

احادیث میں حضرت مہدیؑ کا ذکر

شیعہ اور اہل سنت کی کتابوں میں اس موضوع پر، کہ صلح وسلامتی، امن وامان اور عدل وانصاف پر مبنی عالمی حکومت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان سے مربوط
"مہدی" نامی ایک شخص کے ذریعہ تشکیل پائے گی، احادیث اس قدر زیادہ ہیں کہ تواتر کی حد سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں۔

اس کے علاوہ شیعوں کی کتابوں میں بھی اس موضوع پر احادیث متواتر ہیں کہ وہ (مہدی موعود) بارہویں امام، جانشین پیغمبر، امام حسینؑ کے نویں فرزند اور امام حسن عسکری کے بلافصل فرزند ہیں۔

اہل سنت کی احادیث

اہل سنت کی کتابوں میں "ظہور مہدیؑ" سے متعلق احادیث کے متواتر ہونے کے سلسلہ میں اتنا ہی کافی ہے کہ اہل سنت علماء نے اس موضوع کو اپنی کتابوں میں واضح طور پر ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ حجاز میں اہل سنت کے عالمی سطح کے سب سے بڑے دینی مرکز "رابطہ عالم اسلامی" نے اس موضوع کے بارے میں حال ہی میں اپنے ایک رسالہ میں یوں لکھا ہے:

"وہ (مہدی موعود) بارہ خلفائے راشدین میں آخری خلیفہ ہیں کہ جن کے بارے میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحیح احادیث میں خبر دی ہے اور مہدیؑ سے متعلق احادیث، پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت سے صحابیوں سے نقل کی گئی ہیں"

اس کے بعد حضرت مہدی (عج) سے متعلق احادیث نقل کرنے والے "بیس اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"ان کے علاوہ بہت سے مختلف گروہوں نے بھی احادیث نقل کی ہیں بعض اہل سنت علماء نے حضرت مہدی سے مربوط احادیث کے بارے میں خصوصی کتابیں لکھی ہیں، جن میں ابونعیم اصفہانی، ابن حجر ہیثمی، شوکانی، ادریس مغربی اور ابوالعباس بن مؤمن قابل ذکر ہیں۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"اہل سنت کے گزشتہ وموجودہ علماء کے ایک گروہ نے مہدی (عج) سے مربوط احادیث کے متواتر ہونے کی تصریح کی ہے۔"

اس کے بعد ان علماء میں سے بعض کا نام ذکر کرنے کے بعد اپنی گفتگو کا خاتمہ اس عبارت پر کرتے ہیں:

"حفّاظ اور محدثین کی ایک جماعت نے واضح طور پر کہا ہے کہ مہدی (عج) سے مربوط احادیث صحیح بھی ہیں اور حسن بھی اور مجموعی طور پر یہ سب احادیث متواتر ہیں اور مہدی کے قیام کا عقیدہ واجب ہے اور یہ اہل سنت والجماعت کے قطعی اور مسلم عقائد میں سے ہے۔ جاہل اور بدعتی افراد کے علاوہ کوئی بھی شخص اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔"

شیعوں کی احادیث

اس سلسلہ میں اسی قدر جاننا کافی ہے کہ اس موضوع پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ اطہارؑ سے سینکڑوں احادیث نقل کی گئی ہیں، یہاں تک کہ یہ احادیث تواتر کی حد سے بھی آگے بڑھ گئی ہیں۔ شیعوں کے نزدیک امام مہدی (عج) کا عقیدہ ضروریات دین میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص شیعوں کے نزدیک رہ کر حضرت مہدیؑ کے ظہور کے بارے میں شیعوں کے عقائد، حضرت مہدی کی بہت سی خصوصیات، علائم ظہور، ان کے طرز حکومت اور نظام کے بارے میں آگاہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

شیعوں کے بزرگ علماء نے ابتدائی صدیوں سے آج تک اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور ان میں اس سلسلہ کی احادیث جمع کی ہیں۔

ہم یہاں پر نمونے کے طور پر چند احادیث کے ذکر کرنے پر اکتفا کرتے ہیں
اور تفصیلی مطالعہ کا شوق رکھنے والے قارئین کو درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنے کی تاکید کرتے ہیں:

"مهدی انقلابی بزرگ"، "نوید امن وامان" اور علامه صدرالدین صدر کی کتاب "المهدی"۔

پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"لولم يبق من الدهر الّا يوم لطول الله ذٰلك اليوم حتى يبعث رجلا من اهل بيتي يملأُها قسطاً وعدلًا كما ملئت ظلماً و جوراً"

"اگر دنیا کی زندگی کا صرف ایک دن باقی رہ جائے، خداوند متعال اس دن کو اتنا طولانی کرے گا کہ میرے خاندان میں سے ایک شخص کو مبعوث کرے تا کہ وہ زمین کو عدل وانصاف سے بھر دے جس طرح ظلم وجور سے بھری ہوئی ہوگی۔"

(یہ حدیث اہل سنت اور شیعوں کی اکثر کتابوں میں نقل ہوئی ہے)

ایک دوسری حدیث میں حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں:

اذا قام القائم حكم بالعدل و ارتفع الجور في ايامه و امنت به السبل و اخرجت الارض بركاتها، و ردكل حق الى اهله، و حكم بين الناس بحكم داود و حكم محمّد فحينئذ تظهر الارض كنوزها، و تبدى بركاتها، و لا يجد الرجل منكم يومئذ موضعا لصدقته ولبره، لشمول الغنى جميع المؤمنين!"

"جب قائم (عج) قیام (ظہور) فرمائیں گے، تو حکومت کو عدل وانصاف کی بنیاد پر قائم کریں گے، ان کے دور حکومت میں ظلم وستم کا خاتمہ ہوگا، ان کے وجود کی برکت سے راستے پر امن بن جائیں گے، زمین اپنی برکتوں کو اگل دے گی اور ہر شخص کو اپنا حق ملے گا، وہ حضرت محمّد اور حضرت داوُدؑ کے مانند لوگوں کے مسائل حل کریں گے، اس وقت زمین اپنے اندر پوشیدہ خزانوں کو آشکار کر دے گی اور اپنی برکتوں کو ظاہر کر دے گی اور محتاجوں کا کہیں نام ونشان نہیں ملے گا کیونکہ تمام مومنین بے نیاز اور مستغنی ہوں گے" (بحار النوار، ج ۱۳ (طبع قدیم)

ہم جانتے ہیں کہ حضرت مهدی (عج) کی غیبت کے دوران امامت وولایت کے راستہ کی بقاامام زمانہ (عج) کے عام نائبین یعنی علماء وفقہا کے ذریعہ ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے:

۱۔ دنیا کے مستقبل کے بارے میں خدا پرستوں اور مادہ پرستوں کے نظریات میں کیا فرق ہے؟
۲۔ کیا فطرت کے طریقہ سے ظہور مھدی (عج) کو ثابت کیا جا سکتا ہے؟ اور کیسے؟
۳۔ کیا ظہور مھدی (عج) کے بارے میں کوئی عقلی دلیل موجود ہے؟
۴۔ اس سلسلہ میں قرآن مجید کیا فرماتا ہے؟
۵۔ اس موضوع پر سنت کا بیان کیا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

معاد کے بارے میں دس سبق

پہلا سبق: ایک اہم سوال

موت اختتام ہے یا آغاز؟

اکثر لوگ موت سے ڈرتے ہیں، کیوں؟

موت ہمیشہ انسان کی آنکھوں کے سامنے ایک وحشتناک ہیولا کے مانند مجسم ہوتی رہی ہے۔ موت کی فکر واندیشہ نے بہت سوں کی زندگی کی شیرینی کے کام ودہن کو تلخ بنادیا ہے۔

لوگ، نہ صرف موت سے ڈرتے ہیں بلکہ قبرستان کے نام سے بھی نفرت کرتے ہیں اور قبروں اور قبرستانوں کو زرق وبرق اور آراستہ کر کے ان کی اصلی ماہیت کو بھلانا چاہتے ہیں۔

دنیا کی مختلف ادبیات میں یہ خوف واضح طور پر نمایاں ہے اور ہمیشہ اسے "موت کا ہیولا"، "موت کا پنجہ" اور "موت کا طمانچہ" جیسی تعبیرات سے یاد کیا جاتا ہے!

جب کسی مردہ کا نام لیتے ہیں، تو مخاطب کو خوف وحشت سے بچانے کے لئے "اب سے روز"، "میری زبان گنگ ہو"، "سات پہاڑوں سے دور"، "اس کی مٹی کے برابر تمھاری عمر ہو" جیسے جملے کہکر مخاطب اور موت کے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس عام تصور کے برعکس کیوں بعض لوگ نہ صرف موت سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ موت کے وقت ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوا کرتی تھی اور فخر کے ساتھ موت کا استقبال کرتے تھے؟

تاریخ کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جب کچھ لوگ آب حیات اور جوانی کی اکسیر کے پیچھے دوڑتے تھے تو اسی وقت بعض لوگ عاشقانہ طور پر جہاد کے محاذوں کی طرف دوڑتے تھے اور موت کا مسکرا کر استقبال کرتے تھے اور کبھی اپنی طولانی زندگی سے شکوہ کرتے ہوئے اپنے معشوق کے دیدار کے دن اور لقاء اللہ کی آرزو اور تمنّا کرتے تھے۔ اور آج بھی ہم حق وباطل کے محاذ پر ان ہی مناظر کا واضح طور پر

مشاہدہ کرتے ہیں کہ کس طرح سرفروش مجاہدین شہادت کے استقبال کے لئے دوڑتے ہیں۔

خوف موت کا اصلی سبب

غور وفکر اور تحقیق کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اس دائمی خوف وحشت کا اصلی سبب صرف دو چیزیں ہیں:

ا۔موت کو فنا سمجھنا

انسان ہمیشہ نیستی (عدم) سے بھاگتا ہے۔ بیماری سے بھاگتا ہے کیونکہ یہ صحت وسلامتی کی نیستی ہے، تاریکی سے خائف ہے کیونکہ یہ روشنی کی نیستی ہے۔فقر ومحتاجی سے ڈرتا ہے کیونکہ یہ تونگری کی نیستی ہے۔حتی کہ انسان کبھی ایک خالی گھر سے بھی ڈرتا ہے اور ایک سنسان بیابان میں خوف سے دوچار ہوجاتا ہے کیون کہ وہاں پر کوئی نہیں ہوتا!

تعجب کی بات یہ ہے کہ انسان خود مردہ سے بھی ڈرتا ہے، مثال کے طور پر ایک ایسے کمرے میں رات گزارنے کے لئے کبھی حاضر نہیں ہوتا ہے جس میں کوئی مردہ پڑا ہو، حالانکہ جب وہی انسان زندہ تھا تو وہ اس سے نہیں ڈرتا تھا!

اب ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کیوں عدم اور نیستی سے خائف ہوتا ہے۔اس کا سبب واضح ہے کہ، ہستی اور ہستی کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے، ایک موجود چیز دوسری موجود چیز سے آشنا ہوتی ہے۔وجود اور عدم کے درمیان ہرگز واقفیت نہیں ہوتی ہے، اس لئے نیستی سے ہماری اجنبیت بالکل فطری بات ہے۔

اب اگر ہم موت کو تمام چیزوں کا خاتمہ سمجھیں اور تصور کریں کہ مرنے سے تمام چیزیں ختم ہوجاتی ہیں تو ہمیں اس سے ڈرنے کا حق ہے، یہاں تک کہ ہم اس کے نام اور تصور سے بھی وحشت کریں تو حق ہے، کیونکہ موت ہم سے ہر چیز کو چھین لیتی ہے۔

لیکن اگر ہم موت کو ایک نئی زندگی، ابدی حیات کا آغاز اور ایک عظیم دنیا کی طرف کھلنے والا دریچہ سمجھیں تو فطری طور پر نہ صرف اس سے وحشت زدہ نہیں ہوں گے بلکہ اس کی طرف پاکیزگی اور سربلندی سے قدم بڑھانے والوں کو مبارک بادبھی دیں گے۔

۲۔ سیاہ اعمال نامے

ہم بعض ایسے افراد کو بھی جانتے ہیں جو موت کو نابودی اور نیستی سے تعبیر نہیں کرتے ہیں اور مرنے کے بعد والی زندگی کے ہرگز منکر نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود موت سے ڈرتے ہیں۔

انھیں موت سے ڈرنے کا حق ہے، ان کی مثال ان خطرناک مجرموں کی جیسی ہے، جو زندان سے باہر نکالے جانے سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ انھیں زندان سے باہر لے جانے کی صورت میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

وہ زندان کی سلاخوں سے محکم چمٹے رہتے ہیں، اس لئے نہیں کہ وہ آزادی سے متنفر ہیں، بلکہ وہ اس آزادی سے ڈرتے ہیں جس کا نتیجہ موت کی سزا ہے، اسی طرح وہ بدکار اور ظالم بھی موت سے ڈرتے ہیں جو اپنے بدن سے روح کے نکلنے کو اپنے برے اعمال اور ظلم وستم کی ناقابل برداشت سزا کا مقدمہ جانتے ہیں۔

لیکن جو لوگ نہ موت کو "فنا" جانتے ہیں اور نہ ان کا "اعمال نامہ سیاہ" ہوتا ہے، وہ موت سے کیوں ڈریں؟

بے شک ایسے لوگ زندگی کو بھی پورے وجود سے چاہتے ہیں، لیکن اس زندگی سے موت کے بعد والی دنیا میں نئی زندگی کے لئے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لئے، ایسی موت کا استقبال کرتے ہیں جو خدا کی مرضی، اس کے مقصد اور افتخار کے لئے ہو۔

دو مختلف نظریئے

ہم نے کہا کہ لوگ دو طرح کے ہیں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو اکثریت میں ہیں، وہ موت سے بیزار اور متنفر ہیں۔

لیکن دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو اس موت کا استقبال کرتے ہیں جو ایک عظیم مقصد کی راہ میں ہو جیسے خدا کی راہ میں شہادت، یا کم از کم جب احساس کرتے ہیں کہ ان کی طبیعی عمر آخر تک پہنچ گئی تو ان پر کسی بھی قسم کا غم واندوہ طاری نہیں ہوتا ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ دونوں گروہوں کے دو مختلف نظریئے ہیں:

پہلا گروہ: ان لوگوں کا ہے جو یا تو موت کے بعد والی دنیا کا بالکل ایمان وعقیدہ نہیں رکھتے ہیں یا

ابھی پوری طرح اس پر یقین پیدا نہیں کر سکے ہیں، لہذا یہ لوگ موت کے لمحہ کو تمام چیزوں کو الوداع کہنے کا لمحہ جانتے ہیں، البتہ تمام چیزوں کو الوداع کہنا وحشتناک ہے، نور اور روشنی سے نکل کر مطلق تاریکی میں قدم رکھنا بہت ہی دردناک ہے۔

اسی طرح کسی مجرم کا زندان سے آزاد ہو کر ایک عدالت میں پیش ہونا بھی وحشتناک ہے جہاں پر اس کے جرم کے اسناد آشکار ہوں۔

دوسرا گروہ: یہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو موت کو ایک نئی زندگی کا آغاز اور ایک محدود و تاریک ماحول سے باہر نکل کر ایک وسیع اور نورانی عالم میں قدم رکھنا جانتے ہیں۔

ان لوگوں کی نظروں میں موت، ایک تنگ اور چھوٹے پنجرہ سے آزاد ہو کر لامحدود آسمان میں پرواز کرنا اور تنگ نظریات، لڑائی جھگڑوں، کشمکشوں، ناراضگیوں، کینہ توزیوں اور جنگ وجدل سے بھرے ایک ماحول سے نکل کر ایک ایسی وادی میں قدم رکھنا ہے جو ان تمام آلودگیوں سے پاک ہو۔ فطری بات ہے کہ ایسے لوگ اس قسم کی موت سے خوفزدہ نہ ہوں اور حضرت علی کے مانند کہیں:

"لابن ابی طالب انس بالموت من الطفل بثدی امه"

"خدا کی قسم فرزند ابیطالب کو موت سے انس اس شیر خوار بچے سے زیادہ ہے جو اپنی ماں کی چھاتیوں سے انس رکھتا ہے۔

"یا فارسی شاعر کے مندرجہ ذیل اشعار کے مانند کہیں:

مرگ اگر مرد است گو نزد من آی تا در آغوشش بگیرم تنگ تنگ!

من از او جانی ستانم جاودان او ز من دلقی ستاند رنگ رنگ!

(موت اگر دلیر ہے تو اس سے کہدو کہ میرے پاس آجائے تا کہ میں اسے اپنی گود میں لے لوں۔ میں نے اس سے جاودانہ زندگی حاصل کی ہے اور اس نے مجھ سے ایک درویشانہ پیراہن لیا ہے)۔

یہ بلا وجہ نہیں ہے کہ ہم تاریخ اسلام میں ایسے افراد کو پاتے ہیں، جو امام حسین علیہ السلام اور ان پر جان نچھاور کرنے والے ساتھیوں کے مانند جس قدر شہادت کا لمحہ ان کے نزدیک آتا تھا، ان کے چہروں پر شادابی بڑھتی جاتی تھی اور اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے کے شوق میں پھولے نہیں سماتے تھے۔

اسی لئے ہم حضرت علی علیہ السلام کی فخر ومباہات سے بھری زندگی کی تاریخ میں پڑھتے ہیں کہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جب ظالم قاتل کی تلوار کی ضرب آپ کے سر اقدس پر لگی تو آپ نے فرمایا:

"فزت وربّ الکعبة"

"ربّ کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا"

یہ واضح ہے کہ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسان خوامخواہ اپنے آپ کو خطرہ میں ڈال دے اور زندگی کی عظیم نعمت سے چشم پوشی کرلے اور عظیم مقاصد تک پہنچنے کے لئے اس سے استفادہ نہ کرے۔

بلکہ مقصود یہ ہے کہ زندگی سے پورا پورا استفادہ کرے لیکن اس کے خاتمہ سے ہرگز خوف زدہ نہ ہو خاص کر اس وقت جب وہ عظیم مقاصد کی راہ پر گامزن ہو۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ لوگ کیوں موت سے ڈرتے ہیں؟ اس کا سبب کیا ہے؟

۲۔ بعض لوگ کیوں موت کا مسکراہٹ سے استقبال کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں شہادت کے عاشق ہوتے ہیں؟

۳۔ موت کے لمحہ کو کس چیز سے تشبیہ دی جاسکتی ہے؟ باایمان پاکیزہ لوگ کیا احساس کرتے ہیں اور بے ایمان ناپاک لوگ کیا محسوس کرتے ہیں؟

۴۔ کیا آپ نے اپنی زندگی میں کسی ایسے شخص کو دیکھا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا ہے؟ ان کا کون سا واقعہ آپ کو یاد ہے؟

۵۔ موت کے بارے میں حضرت علی کا کیا نظریہ ہے؟

دوسرا سبق: معاد زندگی کو معنی بخشتی ہے

گرہم اس دنیا کی زندگی کو دوسری دنیا (آخرت) کی زندگی سے قطع نظر تصور کریں تو یہ بالکل بے معنی اور فضول ہوگی۔

اس صورت میں ہماری اس دنیا کی زندگی بالکل اس کے مانند ہوگی کہ ہم جنین کے دوران بچے کی زندگی اس دنیا کی زندگی سے قطع نظر تصور کریں۔

ماں کے شکم میں موجود بچہ، جو اس محدود و تنگ و تاریک زندان میں مہینوں قید و بند رہتا ہے، اگر عقل وشعور رکھتا اور اپنی جنین والی زندگی کے بارے میں فکر کرتا تو وہ بیشک تعجب کرتا:

میں کیوں اس تاریک زندان میں قید و بند ہوں؟

میں کیوں اس پانی اور خون میں ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں؟

آخر میری زندگی کا کیا نتیجہ ہوگا؟

میں کہاں سے آیا ہوں اور میرے آنے کا کیا فائدہ ہے؟

لیکن اگر اسے بتایا جائے کہ یہ تیرے لئے ایک ابتدائی مرحلہ ہے یہاں پر تمھارے اعضاء بن جائیں گے، توانا ہوجاؤ گے اور ایک بڑی کوشش وحرکت کے لئے آمادہ ہوجاؤ گے۔

نو مہینے گزرنے کے بعد اس زندان سے تمھاری رہائی کا حکم جاری کیا جائے گا۔ اس کے بعد تم ایک ایسی دنیا میں قدم رکھو گے جہاں پر چمکتا سورج، روشن چاند، سرسبز درخت، پانی کی جاری نہریں او گونا گوں نعمتیں ہوں گی۔ یہ سننے کے بعد وہ اطمینان کا سانس لے کر کہے گا! اب میں سمجھ گیا کہ یہاں پر میری موجودگی کا فلسفہ کیا ہے!

یہ ایک ابتدائی مرحلہ ہے، یہ چھلانگ لگانے کا چبوترہ ہے، یہ ایک بڑی یونیورسٹی میں داخلہ لینے کے لئے ایک کلاس ہے۔

لیکن اگر جنین والی زندگی کا رابطہ اس دنیا سے کٹ جائے تو تمام چیزیں تاریک اور بے معنی ہوکر رہ جائیں گی اور جنین والی زندگی ایک وحشتناک، تکلیف دہ، اور بے نتیجہ زندان میں تبدیل ہوجائے گی۔

اس دنیا کی زندگی اور موت کے بعد والی دنیا کے درمیان بھی ایسا ہی رابطہ ہے۔

کیا ضروری ہے کہ ہم اس دنیا میں ستر سال یا اس سے کم یا زیادہ زندگی گزاریں اور مشکلات کے درمیان ہاتھ پاؤں مارتے رہیں؟

کچھ مدت بے تجربہ اور خام رہیں، جب ہماری خامی پختگی میں تبدیل ہو تو ہماری عمر تمام ہوجائے!

ایک مدت تک علم ودانش حاصل کریں، جب ہم معلومات کے لحاظ سے پختہ ہوجاتے ہیں تو بڑھاپا ہمارے سر پر آپہنچتا ہے!

آخر ہم کس لئے زندگی بسر کرتے ہیں؟ غذا کھانے، لباس پہنے اور سونے کے لئے؟ اسی حالت میں زندگی کو دسیوں سال تک جاری رکھنے کا مطلب کیا ہے؟

کیا حقیقت میں یہ کشادہ آسمان، وسیع زمین، یہ سب مقدمات، یہ علم اور تجربے حاصل کرنا، یہ سب اساتذہ اور مربی سب کے سب صرف اسی کھانے پینے اور لباس پہننے اور پست وتکراری زندگی کے لئے ہیں؟

یہاں پر معاد کو قبول کرنے والوں کے لئے زندگی کا فضول ہونا یقینی بن جاتا ہے، کیونکہ وہ ان معمولی امور کو زندگی کا مقصد قرار نہیں دے سکتے ہیں اور موت کے بعد والی دنیا پر تو ایمان ہی نہیں رکھتے ہیں لہذا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ ان میں سے بعض لوگ خود کشی کا اقدام کرکے اس بے مقصد زندگی سے نجات پانا چاہتے ہیں۔

لیکن اگر ہم یقین کریں کہ دنیا "آخرت کی کھیتی" ہے، دنیا ایسا کھیت ہے جس میں ہمیں بیج بونا ہے تا کہ اس کی فصل کو ہم ایک جاودانی اور ابدی زندگی میں کاٹ سکیں۔

دنیا ایک ایسا کالج ہے جس میں ہمیں آگاہی حاصل کرنا ہے تا کہ ایک ابدی عالم کے لئے خود کو آمادہ کرسکیں، دنیا ایک گزرگاہ اور پل ہے جس سے ہمیں عبور کرنا ہے۔

اس صورت میں ہماری دنیوی زندگی بے مقصد اور فضول نہیں ہوگی، بلکہ ایک ایسی ابدی اور جاودانی زندگی کا مقدمہ ہوگی جس کے لئے ہم جس قدر کوشش کریں کم ہے۔

جی ہاں معاد کا ایمان انسان کی زندگی کو مفہوم اور معنی بخشتا ہے اور اسے اضطراب، پریشانی اور بیہودگی سے نجات دلاتا ہے۔

عقیدۂ معاد کا انسان کی تربیت میں اہم کردار

اس کے علاوہ آخرت میں ایک عظیم عدالت کے وجود کا عقیدہ ہماری اس زندگی میں غیر

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

معمولی طور پر مؤثر ہے۔

فرض کریں ایک ملک میں یہ اعلان ہوجائے کہ سال کے فلاں دن کسی بھی جرم کی سزا نہیں ہوگی ،اس دن کوئی کیس درج نہیں ہوگا اور لوگ مکمل اطمینان کے ساتھ اس دن کو کسی سزا کے بغیر گزار سکتے ہیں ،اس دن پولیس اور امن وانتظام کے مامورین تعطیل کریں گے،عدالتیں بند ہوں گی، یہاں تک کہ دوسرے دن جب زندگی معمول پر آجائے گی،گزشتہ کل کی جرائم کو عدالتوں میں پیش نہیں کیا جائے گا۔

ذرا غور کیجئے اس دن معاشرہ کی کیا حالت ہوگی؟

قیامت پر ایمان درحقیقت ایک عظیم عدالت پر ایمان ہے جو اس دنیا کی عدالتوں کے ساتھ قابل موازنہ نہیں ہے۔

اس عظیم عدالت کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ایک ایسی عدالت ہے،جس میں نہ سفارش چلے گی اور نہ "ضوابط" پر "روابط" کی حکمرانی ہوگی اور نہ جھوٹے مدارک پیش کرکے اس کے قاضیوں کی سوچ کو تبدیل کیا جاسکے گا۔

۲۔ایک ایسی عدالت ہے جس میں اس دنیا کی عدالتوں کے مانند عدالتی کاروائی نہیں ہوگی اور اسی لئے وہاں پر لمبے اور تفصیلی مراحل نہیں ہیں،برق آسا تحقیقات کے بعد صحیح اور دقیق حکم جاری کردیا جاتا ہے۔

۳۔ایک ایسی عدالت ہے جہاں پر مجرموں کے جرائم کے دلائل ومدارک خود ان کے اعمال ہوں گے،یعنی اس عدالت میں خود اعمال حاضر ہوکر گواہی دیں گے،اور مجرم کے ساتھ اپنے ارتبا کو وہ خود اس طرح مشخص کریں گے کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔

۴۔اس عدالت کے گواہ انسان کے اپنے ہاتھ، پاؤں ،کان،آنکھیں،زبان اور اس کے بدن کی جلد حتی جس جگہ پر گناہ یا ثواب انجام دیا ہوگا اس کی زمین اور درودیوار ہوں گے، یہ ایسے گواہ ہیں جو انسان کے اعمال کے فطری آثار کے مانند قابل انکار نہیں ہیں۔

۵۔اس عدالت کا قاضی اور حاکم خدا ہے، جو ہر چیز سے آگاہ اور بے نیاز اور سب سے بڑا عادل ہے۔

۶۔اس کے علاوہ اس عدالت کی جزاوسزا قراردادی نہیں ہیں،اکثر خود ہمارے اعمال ہی مجسّم ہوکر ہمارے سامنے ظاہر ہوتے ہیں اور ہمیں اذیت وآزار پہنچاتے ہیں یا ہمیں نعمت وآسائش

میں غرق کرتے ہیں۔

اس قسم کی عدالت کا یقین انسان کو ایک ایسی جگہ پر پہنچاتا ہے، جہاں پر وہ علی علیہ السلام کے مانند کہتا ہے:

"خدا کی قسم اگر مجھے نرم بستر کے بجائے راتوں کو صبح تک مہلک کانٹوں پر جاگتے ہوئے گزارنا پڑے اور دن کو میرے ہاتھوں اور پاؤں میں زنجیریں باندھ کر مجھے گلی اور بازاروں میں گھسیٹا جائے، یہ مجھے اس سے کہیں زیادہ پسند ہے کہ میں اللہ کی عدالت میں اس حال میں حاضر کیا جاؤں کہ میں نے کسی بندے پر ظلم کیا ہو یا کسے کا حق غصب کیا ہو۔" (نہج البلاغہ، خطبہ: ۲۲۴)

یہ اس عدالت کا ایمان ہے جو انسان (حضرت علی) کو مجبور کرتا ہے کہ وہ آگ میں دہکتا ہوا سرخ لوہا اپنے بھائی کے ہاتھ کے قریب لے جائے، جو بیت المال سے اپنے حصہ سے زیادہ کا طالب تھا، جب اس کا بھائی ڈر کے مارے فریاد بلند کرتا ہے، تو اسے نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے: "تم اس آگ سے ڈرتے ہو جو ایک کھلونے کے مانند انسان کے ہاتھ میں ہے، لیکن اپنے بھائی کو ایک ایسی ہولناک آگ کی طرف ڈھکیل رہے ہو جسے خدا کے قہر وغضب کے شعلوں نے بھڑکایا ہے؟" (نہج البلاغہ، خطبہ ۲۲۴)

کیا ایسے ایمان رکھنے والے انسان کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے؟

کیا رشوت سے اس کے ایمان کو خریدا جا سکتا ہے؟

کیا اسے لالچ اور دھمکی سے حق کی راہ سے ظلم کی طرف منحرف کیا جا سکتا ہے؟

قرآن مجید فرماتا ہے: جب گناہ کار اپنے اعمال ناموں کو دیکھیں گے تو چیختے ہوئے کہیں گے:

مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ

(سورہ کہف/۴۹)

"ہائے افسوس اس کتاب نے تو چھوٹا بڑا کچھ گناہ نہیں چھوڑا ہے اور سب کو جمع کر لیا ہے۔"

اس طرح ہر کام انجام دیتے وقت انسانی روح کی گہرائیوں میں ذمہ داری کے احساس کی ایک طاقتور موج پیدا ہوتی ہے اور یہی احساس اسے ہر قسم کے انحرافات، گمراہی اور ظلم و زیادتی سے بچاتا ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔اگراس محدوداورناپائیدارزندگی کے بعددوسری دنیانہ ہوتی توکیاہوتا؟

۲۔معاد کے منکربعض افرادکیوں خودکشی کااقدام کرتے ہیں؟

۳۔قیامت کی عدالت کااس دنیاکی عدالت سے کیافرق ہے؟

۴۔معادپرایمان،انسان کے اعمال پرکیااثرڈالتاہے؟

۵۔امیرالمومنین علی علیہ اسلام نے اپنے بھائی عقیل سے کیاکہا؟وہ کیاچاہتے تھےاورعلی علیہ السلام نے انھیں کیاجواب دیا؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

تیسرا سبق

قیامت کی عدالت کا نمونہ خود آپ کے وجود میں ہے۔

چونکہ موت کے بعد کی زندگی اور قیامت کی عظیم عدالت کا مسئلہ اس محدود دنیا میں مقیّد انسان کے لئے ایک نئی بات ہے۔لہذا خداوند متعال نے اس عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہمارے لئے اسی دنیا میں پیش کیا ہے،جس کا نام "ضمیر (وجدان) کی عدالت" ہے۔لیکن یہ بات نہ بھولیں کہ ہم نے کہا ہے کہ یہ عدالت اس عظیم عدالت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔

اس بات کی بیشتر وضاحت یوں ہے:

انسان، جو بھی اعمال انجام دیتا ہے،ان کے سلسلہ میں کئی عدالتوں میں اس کا مقدمہ چلتا ہے:

پہلی عدالت،تمام کمزریوں اور نقائص کے باوجود وہی دنیوی اور انسانی عام عدالت ہے۔

اگر چہ ان ہی دنیوی عدالتوں کا جرائم کو کم کرنے میں نمایاں اثر ہوتا ہے،لیکن ان عدالتوں کی بنیاد ایسی ہے کہ ان سے مکمل انصاف کے نفاذ کی ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی ہے۔

کیوں کہ اگر ان عدالتوں میں ناقص قوانین اور نالائق جج کا نفوذ ہوگا تو ان کی حالت معلوم ہے کیا ہوگی! رشوت ستانی ، پارٹی بازی: خصوصی روابط،سیاست بازی اور اس قسم کے ہزاروں دوسرے مسائل اس عدالت کو اس قدر متأثر کر دیتے ہیں کہ اس کے ہونے سے نہ ہونا ہی بہتر ہے، کیونکہ ایسی عدالتوں کا وجود خودغرض لوگوں کے برے مقاصد پورے ہونے کا سبب بنتا ہے!

اگر ان عدالتوں کے قوانین عدل وانصاف پر مبنی اور قاضی آگاہ اور باتقوی بھی ہوں ،تب بھی بہت سے مجرم ایسے ہوتے ہیں جو اس قدر ماہرانہ چال چلتے ہیں ۔کہ جرم کے آثار کو ہی نابود کر کے رکھدیتے ہیں۔

یا عدالت میں ایسی کاغذ بازی کرتے ہیں اور ایسا داؤں پیچ مارتے ہیں کہ قاضی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر قوانین کو بے اثر کر دیتے ہیں۔

دوسری عدالت، جو اس عدالت سے منظم اور دقیق تر ہے وہ "مکافات عمل" کی عدالت ہے۔

ہمارے اعمال کے کچھ اثرات ہوتے ہیں، جو جلدی یا دیر سے رونما ہو کر ہمیں متاثر کرتے ہیں ۔اگر چہ یہ امر مطلق اور عام نہیں ہے، لیکن کم از کم بہت سے مواقع پر سچ ثابت ہوتا ہے۔

ہم نے ایسی حکومتیں بھی دیکھی ہیں جن کی بنیاد ظلم و ستم پر تھی اور حکام جو چاہتے کر ڈالتے تھے، لیکن سرانجام اپنے ہی پھیلائے گئے جال میں پھنس گئے ہیں۔ان کے اعمال کے ردعمل (اثر) نے انھیں جکڑ لیا اور ایسے زوال سے دوچار کر دیا کہ وہ بالکل نسیاً منسیا ہو گئے ہیں اور لعنت و نفرین کے سوا ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا ہے۔ چونکہ مکافات عمل وہی علت و معلول کے درمیان رابطہ ہے، اس لئے بہت کم لوگ ایسے ہیں جو چالاکی سے اس کی گرفت سے بچ نکلیں۔

اس عدالت کا نقص یہ ہے کہ یہ عمومی اور کلی نہیں ہے، اس لئے اس عدالت کے ہوتے ہوئے ہم قیامت کی عظیم عدالت سے بے نیاز نہیں ہیں۔

تیسری عدالت، جو اس سے بھی منظم اور دقیق تر ہے، وہ "ضمیر کی عدالت" ہے۔

حقیقت میں جس طرح نظام شمسی ایک عظیم اور حیرت انگیز نظام کے باوجود ایٹم کی ایک انتہائی چھوٹے ذرّہ کے اندر سمٹا ہوا ہے، اسی طرح قیامت کی عظیم عدالت کا ایک چھوٹا سا ماڈل ہماری روح میں پایا جاتا ہے۔

انسان کے وجود کے اندر ایک مرموز طاقت ہے، جسے فلاسفر نے "عقل عملی" کا نام دیا ہے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں اسے "نفس لوامہ" کہا جاتا ہے اور آج اسے "وجدان" اور "ضمیر" کے نام سے جانتے ہیں۔

جوں ہی انسان کسی اچھے یا برے کام کو انجام دیتا ہے، فوراً یہ عدالت کسی شور وغل کے بغیر تشکیل پاتی ہے، اور مکمل طور پر صحیح اور اصولوں پر مبنی محاکمہ شروع کرتی ہے اور حکم کے نتیجہ کو نفسیاتی سزا یا جزا کی صورت میں نافذ کرتی ہے۔

یہ عدالت کبھی مجرموں کو اندر سے ہی ایسے کوڑے مار کر روحی اذیت پہنچاتی ہے کہ وہ دل سے موت کا استقبال کرتے ہیں اور اسے زندگی پر ترجیح دیتے ہیں اور اپنے وصیت نامہ میں لکھتے ہیں کہ ہم نے ضمیر کے اضطراب کی وجہ سے خودکشی کی ہے!

کبھی انسان کے ایک نیک کام انجام دینے کے نتیجہ میں اس قدر اس کی اہمیت افزائی کرتے ہے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کہ اس میں وجد وسرور کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، وہ اپنے وجود میں ایک گہرا سکون محسوس کرتا ہے، دل کو لبھانے والا ایک ایسا سکون، جس کی لذت قابل بیان نہیں ہوتی ہے۔

اس عدالت کی عجیب خصوصیات ہیں:

۱۔ اس عدالت میں قاضی، شاہد، حکم نافذ کرنے والا اور عدالت کی کاروائی دیکھنے والا سب ایک ہی ہے، وہی ضمیر کی طاقت ہے جو شہادت بھی دیتی ہے، فیصلہ بھی کرتی ہے اور اس کے بعد آستین چڑھا کر اپنے حکم کو نافذ بھی کرتی ہے!

۲۔ اس عدالت کا فیصلہ عام عدالتوں کے برخلاف (کہ جن میں کیس کو کئی سال لگتے ہیں) فوری ہوتا ہے، عام طور پر اس میں وقت نہیں لگتا ہے، البتہ کبھی جرم کے دلائل ثابت ہونے اور دل کی آنکھوں کے سامنے سے غفلت کے پردے ہٹنے میں وقت کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن دلائل پیش ہونے کے بعد، حکم فوری اور قطعی طور پر سنا دیا جاتا ہے۔

۳۔ اس عدالت کا حکم ایک ہی مرحلہ میں انجام پاتا ہے، یہاں پر اپیل، نظر ثانی اور سپریم کورٹ جیسی چیزوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

۴۔ یہ عدالت صرف سزائیں نہیں دیتی ہے بلکہ فرائض انجام دینے والوں کو جزا بھی دیتی ہے۔ اس لئے یہ ایک ایسی عدالت ہے جس میں نیک وبد دونوں کے کیس کی تحقیق وشنوائی ہوتی ہے اور ان کے اعمال کے تناسب سے انھیں سزا یا جزا ملتی ہے۔

۵۔ اس عدالت کی سزاؤں کی دنیا کی عام عدالتوں کی سزاؤں سے کوئی شباہت نہیں ہے۔ بظاہر نہ کوئی زندان ہے، نہ کوڑے، نہ تختہ دار اور نہ گولیوں کی مار، لیکن اس عدالت کا حکم مجرم کو اندر سے ایسا جلاتا ہے اور جیل میں ڈال دیتا ہے کہ اس کے لئے دنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود تنگ ہوجاتی ہے ایسی کہ ایک جیل کی خوفناک اور تنگ وتاریک کال کوٹھری سے بھی زیادہ تنگ ہوجاتی ہے۔

مختصر یہ کہ عدالت اس دنیا کی عدالتوں کی جیسی نہیں ہے بلکہ قیامت کی عدالت کے مانند ہے۔

اس عدالت کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید نے اس کی قسم کھائی ہے اور اسے قیامت کی عدالت کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے سورۂ قیامت کی آیت نمبر ۱ سے ۴ تک ارشاد فرماتا ہے:

لَآ اُقْسِمُ بِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۝١ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝٢ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ

اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾ بَلٰی قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ نُّسَوِّیَ بَنَانَہٗ ﴿۴﴾

"میں روز قیامت کی قسم کھاتا ہوں اور برائیوں پر ملامت کرنے والے نفس کی قسم کھاتا ہوں۔کیا یہ انسان یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو جمع نہ کر سکیں گے؟ یقینا ہم اس بات پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پور تک درست کر سکیں۔"

لیکن ان تمام اوصاف کے باوجود ضمیر کی عدالت دنیوی ہونے کی وجہ سے کچھ نقائص رکھتی ہے،جس کی وجہ سے یہ ہمیں قیامت کی عدالت سے بے نیاز نہیں کر سکتی ہے۔کیونکہ:

۱۔ضمیر کے حدود کے دائرہ میں تمام چیزیں نہیں آسکتی ہیں کیونکہ ضمیر کے حدود انسان کی فکر و تشخیص کے قلمرو کے مطابق ہوتے ہیں۔

۲۔کبھی ایک ماہر دھوکہ باز اور چالباز انسان اپنے ضمیر کو بھی دھوکہ دے سکتا ہے یعنی اپنے ضمیر کی آنکھوں میں بھی دھول جھونک سکتا ہے۔

۳۔کبھی بعض گناہگاروں کے ضمیر کی آواز اس قدر کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی۔

لہٰذا چوتھی عدالت یعنی قیامت کی عظیم عدالت کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔حقیقت میں انسان کا محاکمہ کتنی عدالتوں میں ہوتا ہے؟

۲۔پہلی عدالت کا نام اور اس کی خصوصیات بیان کیجئے۔

۳۔دوسری عدالت کی خصوصیات کیا ہیں؟

۴۔تیسری عدالت کی خصوصیات کیا ہیں؟

۵۔ضمیر کی عدالت کی خصوصیات اور نقائص بیان کیجئے۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

چوتھا سبق: معاد، فطرت کی جلوہ گاہ میں

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا کی معرت انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اگر ہم ایک انسان کے آگاہ اور ناآگاہ ضمیر پر تحقیق وجستجو کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ ایک ایسے ماورائے طبیعت خالق پر ایمان رکھتا ہے جس نے علم، منصوبہ اور مقصد کے مطابق اس کائنات کو پیدا کیا ہے۔

لیکن یہ مسئلہ "توحید وخداشناسی" تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ دین کے تمام بنیادی اصول اور فروع انسان کی فطرت کے اندر ہونے چاہئے، اگر ایسا نہ ہوتو "تشریعی" اور "تکوینی" احکام کے درمیان ضروری ہم آہنگی حاصل نہیں ہوگی۔ (توجہ فرمائیے)

اگر ہم اپنے دل پر ایک نگاہ ڈالیں اور اپنی روح وجان کی گہرائیوں میں اتر کر جستجو اور تحقیق کریں، تو ہم اپنے دل کے کانون سے یہ گنگناہٹ سنیں گے کہ زندگی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوتی ہے، بلکہ موت عالم بقاء کی طرف کھلنے والا ایک دریچہ ہے!

اس حقیقت کو ماننے کے لئے ہمیں مندرجہ ذیل نکات پر توجہ کرنی چاہئے:

۱۔ بقاء کا عشق

اگر انسان کو واقعاً فنا اور نابودی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، تو اسے فنا اور نابودی کا عاشق ہونا چاہئے، اور اپنی عمر کے آخر میں موت سے لذت حاصل کرنی چاہئے۔ لیکن ہم اس کے برعکس دیکھتے ہیں کہ انسان کے لئے موت کا چہرہ (نابودی کے معنی میں) کسی بھی زمانہ میں نہ صرف خوشگوار نہیں ہے بلکہ وہ ہر ممکن صورت میں اس سے بھاگتا ہے۔

ہمارا بقاء کے ساتھ یہ عشق بتاتا ہے کہ ہم بقاء کے لئے خلق کئے گئے ہیں، اور اگر ہم فنا کے لئے پیدا کئے گئے ہوتے تو اس عشق ومحبت کے کوئی معنی نہیں تھے۔

ہمارے اندر پائے جانے والے تمام بنیادی عشق ہمارے وجود کو مکمل کرتے ہیں، بقاء کے ساتھ ہمارا عشق بھی ہمارے وجود کو مکمل کرنے والا ہے۔

یہ نہ بھولئے کہ ہم نے "معاد" کی بحث کو خداوند حکیم وعلیم کے وجود کو قبول کرنے کے بعد شروع کیا ہے، ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ نے جو کچھ ہمارے وجود میں خلق کیا ہے وہ حساب وکتاب کے مطابق ہے،

اس لحاظ سے انسان کا بقاء کے ساتھ عشق کا بھی کوئی حساب و کتاب ہونا چاہئے اور وہ اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا کے وجود کے علاوہ کوئی چیز نہیں ہوسکتا۔

۲۔گزشتہ اقوام میں قیامت کا عقیدہ

تاریخ بشر جس طرح گواہی دیتی ہے کہ زمانہ قدیم سے گزشتہ اقوام میں کلی طور پر مذہب کا وجود تھا،اسی طرح قدیم ترین زمانہ سے انسان کے"موت کے بعد والی زندگی" کے بارے میں راسخ عقیدہ کی بھی گواہی دیتی ہے۔

قدیمی حتی،قبل تاریخ کے انسانوں کے بارے میں ملنے والے آثار، بالخصوص قبور کی تعمیر اور مردوں کو دفن کرنے کے طریقے اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ وہ موت کے بعد والی زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔

انسان میں ہمیشہ سے پائے جانے والے اس بنیادی عقیدہ کو محض ایک معمولی مسئلہ نہیں سمجھا جا سکتا ہے یا اسے ایک عادت یا تلقین کا نتیجہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔

جب بھی ہم انسانی معاشروں میں پوری تاریخ کے دوران مستحکم بنیادوں پر مبنی کسی عقیدہ کو پائیں تو ہمیں اسے فطری ہونے کی علامت سمجھنا چاہئے، کیونکہ یہ صرف فطرت ہی ہے جو زمانہ حوادث اور اجتماعی و فکری تبدیلیوں کا مقابلہ کرسکتی ہے اور ثابت قدم رہ سکتی ہے، ورنہ عادات، رسومات اور تلقینیں زمانہ کے گزرنے کے ساتھ فراموش ہوجاتی ہیں۔

کسی خاص لباس کا پہننا ایک عادت یا آداب ورسوم کا حصہ ہے،لہذا حالات کے بدلنے یا زمانہ کے گزرنے سے اس میں تبدیلی آجاتی ہے۔

لیکن بیٹے کی نسبت ماں کی محبت ایک غریزہ اور فطرت ہے،لہذا نہ ماحول اور حالات کی تبدیلی اس کے شعلے کو خاموش کرسکتی ہے اور نہ زمانہ کے گزرنے کی وجہ سے اس پر گرد وغبار پڑسکتا ہے۔اس طرح کی ہر کشش پیدا ہونے کی صورت میں جاننا چاہئے کہ یہ انسان کی فطرت کی دلیل ہے۔، جب دانشور کہتے ہیں: "دقیق تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے ابتدائی اقوام بھی کسی نہ کسی مذہب کے پیرو تھے کیونکہ وہ اپنے مردوں کو ایک خاص طریقے پر دفن کرتے تھے اور ان کے کام کرنے کے آلات و وسائل کو ان کے ساتھ رکھتے تھے،اور اس طرح دوسری دنیا(آخرت) کے وجود پر اپنے عقیدہ کو ثابت کرتے تھے(۱)۔"

توہمیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ یہ اقوام موت کے بعد والی زندگی کا عقیدہ رکھتے تھے، اگر چہ وہ اس سلسلہ میں غلط راہ پر چلتے تھے اور یہ تصور کرتے تھے کہ موت کے بعد والی زندگی بھی اس دنیوی زندگی کے مشابہ ہے، اس لئے اس دنیا کے آلات اور ساز وسامان کی وہاں بھی ضرورت پڑے گی۔

۳۔ معاد کے فطری ہونے کی ایک اور دلیل انسان کے اندر وجدان وضمیر کی عدالت کا وجود ہے۔

جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی بیان کیا کہ ہم سب بخوبی احساح کرتے ہیں کہ ہماری یہ اندرونی عدالت ہمارے اعمال کی تفتیش کرتی ہے، نیکیوں کے مقابلہ میں جزا دیتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم ایسا آرام اور سکون کا احساس کرتے ہیں کہ ہماری روح نشاط وشادی کی ایک ایسی لذت محسوس کرتی ہے، جس کی توصیف سے زبامان اور قلم عاجز ہیں۔ اور بُرے کاموں بالخصوص گناہان کبیرہ کے مقابلہ میں ایسی سزا دیتی ہے جو انسان کے لئے زندگی کو تلخ بنا دیتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض افراد نے ایک بڑے ظلم وجرم جیسے قتل کے ارتکاب کے بعد عدالت سے فرار کرنے کے بعد رضا کارانہ طور پر خود کو عدالت میں پیش کیا ہے اور جرم کا اعتراف کرنے کے بعد پھانسی کے پھندے کا استقبال کیا ہے اور اس کی وجہ ضمیر کے شکنجہ اور روحی عذاب سے نجات حاصل کرنا بتایا ہے۔

اس باطنی وروحی عدالت کا مشاہدہ کرنے کے بعد انسان اپنے آپ سے یہ

۱۔ جامعہ شناسی "کینگ"، ص ۱۹۲

سوال کرتا ہے: یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک چھوٹا وجود رکھنے کے باوجود میرے اندر ایک ایسی عدلات موجود ہو، لیکن اس عظیم کائنات کی کوئی عدالت نہ ہو؟!

اس لئے معاد کے عقیدہ اور موت کے بعد زندگی کے فطری ہونے کو درج ذیل تین راہوں سے ثابت کیا جا سکتا ہے:

۱۔ بقاء کا عشق۔

۲۔ پوری تاریخ بشریت میں اس ایمان اور عقیدہ کا وجود۔

۳۔ انسان کی روح کے اندر اس کے ایک چھوٹے سے نمونہ کا وجود۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔غیر فطری امور کو فطری امور سے کیسے جدا کیا جا سکتا ہے؟

۲۔انسان کی بقاء سے عشق رکھنے کی دلیل کیا ہے؟اور یہ بقاء کا عشق کیسے معاد کے فطری ہونے کی دلیل بن سکتا ہے؟

۳۔کیا گزشتہ اقوام بھی معاد کا عقیدہ رکھتے تھے؟

۴۔ہمارے ضمیر کی عدالت کیسے ہمیں جزا یا سزا دیتی ہے؟اس کی دلیل اور کچھ نمونے بیان کیجئے۔

۵۔ضمیر کی عدالت اور قیامت کی عظیم عدالت کے درمیان کیا ربط ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

پانچواں سبق: قیامت، انصاف کی ترازو میں

کائنات کے نظام اور خلقت کے قوانین پر تھوڑا سا غور کرنے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ہر جگہ قانون کی حکمرانی ہے اور ہر چیز اپنی جگہ پر برقرار ہے۔

یہ عادلانہ نظام، انسان کے بدن میں اس قدر باریکی کے ساتھ قائم ہے کہ اس میں چھوٹی سی تبدیلی اور ناہم آہنگی بیماری یا موت کا سبب بن جاتی ہے۔

مثال کے طور پر آنکھ، دل اور مغز کی بناوٹ میں ہر چیز اپنی جگہ پر ہے اور ضروری حد تک یہ عدالت اور نظم نہ صرف انسان کے بدن میں موجود ہے بلکہ تمام کائنات پر حکم فرما ہے، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے:

"بالعدل قامت السموات و الارض"

"عدل کے ذریعہ آسمان اور زمین قائم ہیں"

ایک ایٹم اس قدر چھوٹا ہے کہ دسیوں لاکھ ایٹم ایک سوئی کی نوک میں سما سکتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ اس ایٹم کی بناوٹ کس قدر دقیق اور منظم ہونی چاہئے کہ کروڑوں سال سے اپنی اس حالت کو قائم رکھتا ہے۔

یہ الیکٹرونوں اور پروٹونوں کے دقیق نظام میں غیر معمولی توازن و تعادل کی وجہ سے ہے اور کوئی بھی بڑا یا چھوٹا سسٹم اس حیرت انگیز نظام سے باہر نہیں ہے۔

کیا واقعاً انسان ایک استثنائی مخلوق ہے؟ اس عظیم کائنات کے لئے ایک ناموزون اور نامنظم جزء اور ایک بے جوڑ پیوند ہے کہ اسے آزاد رہنا چاہئے اور جس بے نظمی، ظلم اور بے انصافی کو چاہے، اس کا مرتکب ہوجائے؟ یا یہاں پر ایک راز مضمر ہے؟

اختیار اور ارادہ کی آزادی

حقیقت میں انسان کائنات کی تمام مخلوقات سے ایک بنیادی تفاوت رکھتا ہے اور وہ اس کا "اختیار اور ارادہ کی آزادی" رکھنا ہے۔

خداوند متعال نے انسان کو کیوں آزاد خلق کیا ہے اور فیصلہ کرنے کا حق اسے بخشتا ہے تا کہ جو

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

چاہے انجام دے؟

اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر وہ آزاد نہ ہوتا تو وہ کمال حاصل نہیں کرسکتا تھا اور یہ عظیم امتیاز انسان کے معنوی واخلاقی کمال کا ضامن ہے۔مثلاً اگر کسی کو نیزے کی نوک پر مستضعفین کی مدد کرنے اور معاشرے کی بھلائی کے کام انجام دینے پر مجبور کیا جائے ،تو بہرصورت یہ نیک کام انجام پا سکتا ہے،لیکن مدد کرنے والے کے لئے کسی قسم کے اخلاقی وانسانی کمال کا سبب نہیں بن سکتا ہے،حالانکہ اگر وہ اپنی مرضی اور ارادہ سے اس کا ایک فی صد حصہ بھی دیدے تو اسی قدر اس نے اخلاقی ومعنوی کمال کی راہ پر قدم بڑھایا ہے۔

اس لئے معنوی واخلاقی کمال حاصل کرنے کی پہلی شرط "اختیار وارادہ کی آزادی" ہے تا کہ انسان اپنی مرضی سے اس راہ کو طے کرے نہ کہ عالم طبیعت کے اضطراری عوامل کی طرح مجبوری کی حالت میں ۔خداوند متعال نے انسان کو یہ نعمت اسی بلند مقصد کے لئے عطا کی ہے۔

لیکن یہ نعمت اس پھول کے مانند ہے جس کے ارد گرد کانٹے بھی اگے ہوتے ہیں،اور یہ کانٹوں کا اگنا انسان کا اس آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ظلم وستم اور گناہ کا مرتکب وآلودہ ہونا ہے۔

البتہ خداوند متعال کے لئے اس میں کوئی مشکل نہیں تھی کہ اگر انسان ظلم وستم کا مرتکب ہوتا تو فوراً اس پر ایک ایسا عذاب نازل کرتا کہ پھر ایسا کبھی سوچتا بھی نہیں ،مثلاً اس کے ہاتھ فلج ہوجاتے ،آنکھیں اندھی ہوجاتیں اور زبان بےکار ہوجاتی۔

صحیح ہے کہ ایسی صورت میں کوئی شخص آزادی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھاتا اور گناہ کے پیچھے نہ جاتا،لیکن حقیقت میں یہ پرہیزگاری اور تقویٰ کا جبری پہلو ہوتا،اور انسان کے لئے کوئی فضیلت نہیں ہوتی بلکہ یہ شدید ،فوری اور بلا فاصلہ سزا سے ڈرنے کے سبب ہوتا۔

لہذا،انسان کو ہر حالت میں آزاد ہونا چاہئے ،اور پروردگار عالم کے گوناگوں امتحانات کے لئے آمادہ ہونا چاہئے ،اور استثنائی مواقع کے علاوہ فوری سزاؤں سے محفوظ رہنا چاہئے تا کہ اپنی وجودی قدر ومنزلت کا مظاہرہ کرسکے۔لیکن یہاں پر ایک مطلب باقی رہ جاتا ہے۔اور وہ یہ ہے:

اگر یہی حالت برقرار رہے اور ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق راستہ کا انتخاب کرے،تو کائنات پر حکم فرما خدا کے قانون عدالت کی خلاف ورزی ہوگی۔

یہاں پر ہمیں یقین پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے لئے ایک عدالت معیّن ہوئی ہے،جس میں بلا استثنا

سب لوگ حاضر کئے جائیں تا کہ اپنے اعمال کی جزا پائیں اور عالم خلقت کی عمومی عدالت سے اپنا حصہ وصول کریں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ وقت کے نمرود، فرعون، چنگیز اور قارون ایک عمر ظلم وستم کرتے رہیں اوران کے لئے کسی قسم کا حساب وکتاب نہ ہو؟

کیا یہ ممکن ہے کہ مجرم اور پرہیز گار دونوں کو پروردگار کی عدالت کی ترازو کے ایک ہی پلّہ میں رکھا جائے؟

قرآن مجید اس سلسلہ میں سورہ قلم کی آیت نمبر ۳۵،۳۶ میں فرماتا ہے:

اَفَنَجۡعَلُ الۡمُسۡلِمِیۡنَ کَالۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۳۵﴾ مَا لَکُمۡ ۟ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۶﴾

"کیا ہم اطاعت گزاروں کو مجرموں جیسا بنادیں۔تمھیں کیا ہوگیا کیسا فیصلہ کررہے ہو؟

ایک اور جگہ پر سورہ ص کی آیت نمبر ۲۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

اَمۡ نَجۡعَلُ الۡمُتَّقِیۡنَ کَالۡفُجَّارِ ﴿۲۸﴾

"کیا ہم صاحبان تقویٰ کو فاسق وفاجر افراد جیسا قرار دے دیں؟"

صحیح ہے کہ بعض گناہگار اسی دنیا میں اپنے برے اعمال کی سزا پاتے ہیں یا اس سزا کے ایک حصہ کو پاتے ہیں۔

صحیح ہے کہ ضمیر کی عدالت ایک اہم مسئلہ ہے۔

اور یہ بھی درست ہے کہ بعض اوقات گناہ اور ظلم وستم کے ردعمل اور بے انصافی کے بُرے نتائج انسان کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتے ہیں۔

لیکن اگر ہم درست اور دقت سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مذکورہ تین امور میں سے کوئی ایک بھی عام نہیں تا کہ ہر ظالم وگناہ کار کو اس کے ظلم اور گناہ کے برابر سزا دے۔ اور بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مکافات عمل کے چنگل، ضمیر کی سزا اور اپنے برے اعمال کے ردعمل سے فرار کر جاتے ہیں یا کافی حد تک سزا نہیں پاتے۔

ایسے افراد اور عام لوگوں کے لئے عدل وانصاف کی ایک عدالت کا ہونا ضروری ہے تا کہ وہاں پر ذرہ برابر بھی نیک اور بُرے کام کا محاسبہ ہو، اگر ایسا نہ ہوگا تو اصلاً عدل وانصاف حاصل نہیں ہوگا۔

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

لہذا "پروردگار کے وجود" اور "اس کے عدل" کو قبول کرنا "قیامت" اور "دوسری دنیا" کے قبول کر نے کے برابر ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے کے جز ولاینفک ہیں۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔آسمان اور زمین عدل کے ذریعہ کیسے قائم ہیں؟

۲۔انسان کو "اختیار وارادہ" کی آزادی کی نعمت سے کیوں نوازا گیا ہے؟

۳۔اگر گناہ گار اسی دنیا میں فوری طور پر اپنے اعمال کی شدید سزا پاتے تو کیا ہوتا؟

۴۔مکافات عمل، ضمیر کی عدالت اور ہمارے اعمال کے ردعمل ہمیں قیامت کی عدالت سے کیوں بے نیاز نہیں کرتے؟

۵۔ "عدل الٰہی" اور "معاد" کے مسئلہ کے درمیان کیا رابطہ ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

معاد کے بارے میں دس سبق

چھٹا سبق: معاد کا اسی دنیا میں مشاہدہ

قرآن مجید کی آیات اس حقیقت کو بخوبی بیان کرتی ہیں کہ بت پرست اور تمام کفار نہ صرف پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکے زمانے میں بلکہ دوسرے زمانوں اور عصروں میں بھی معاد اور موت کے بعد زندہ ہونے کے مسئلہ پر تعجب اور وحشت کا اظہار کرتے تھے، حتیٰ اس قسم کا اعتقاد رکھنے والوں کو دیوانہ شمار کرتے ہوئے ایک دوسرے سے کہتے تھے:

هَلْ نَدُلُّكُمْ عَلٰى رَجُلٍ يُّنَبِّئُكُمْ اِذَا مُزِّقْتُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ ۙ اِنَّكُمْ لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۚ﴿۷﴾ اَفْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَمْ بِهٖ جِنَّةٌ ۭ (سبا/۷۔۸)

"کیاان کا کہنا ہے کہ ہم تمھیں ایسے آدمی کا پتہ بتائیں گے جو یہ خبر دیتا ہے کہ جب تم مرنے کے بعد ٹکڑے ٹکڑے ہو جاؤ گے تو تمھیں نئی خلقت کے بھیس میں لایا جائے گا۔اس نے اللہ پر جھوٹا الزام باندھا ہے یا اس میں جنون پایا جاتا ہے۔"

جی ہاں، اس روز لاعلمی جہالت اور تنگ نظری کے سبب، موت کے بعد والی دنیا اور مردوں کے زندہ ہونے کے عقیدہ کو ایک قسم کی دیوانگی یا خدا پر تہمت شمار کیا جاتا تھا۔اور بے روح مادہ (مرنے کے بعد خاک میں ملے جسم) سے چشمہ حیات کے جاری ہونے کے عقیدہ کو دیوانگی سے تعبیر کیا جاتا تھا۔

لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے اس قسم کے افکار کے مقابلہ میں مختلف دلائل پیش کی ہیں، کہ ان سے عام لوگوں کے علاوہ بڑے دانشور اور مفکرین بھی اپنی فکری صلاحیتوں کے مطابق استفادہ کر سکتے ہیں۔

اگر چہ قرآن مجید کی ان دلائل کی تشریح کرنے کے لئے ایک مستقل کتاب تألیف کرنے کی ضرورت ہے، لیکن ہم یہاں پر ان کے چند نمونے پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

ا۔کبھی قرآن مجیدان سے کہتا ہے کہ تم لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں اپنی آنکھوں سے ہمیشہ معاد کے مناظر کا مشاہدہ کررہے ہیں کہ کس طرح بعض مخلوقات مرتی ہیں اور پھر زندہ ہوتی ہیں،کیااس کے باوجود بھی تم لوگ معاد کے مسئلہ میں شک وشبہہ کرتے ہو؟!

وَاللّٰهُ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّيِّتٍ فَاَحْيَيْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ كَذٰلِكَ النُّشُوْرُ ۝۹ (سورہ فاطر/۹)

"اللہ ہی وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تو وہ بادلوں کو منتشر کرتی ہیں اور پھر ہم انھیں مردہ شہر تک لے جاتے ہیں اور زمین کے مردہ ہوجانے کے بعد اسے زندہ کردیتے ہیں،اسی طرح مردے دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔"

موسم سرما میں جب ہم طبیعت کے چہرہ پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں ہر سو موت کے آثار نظر آتے ہیں،درخت پتوں، پھولوں اور میوؤں سے خالی پڑے ہیں اور خشک لکڑی بن کر اپنی جگہوں پر بے حرکت کھڑے ہیں، نہ کوئی پھول مسکراتا ہے اور نہ کوئی کلی کھلتی دکھائی دیتی ہے اور نہ پہاڑوں اور صحراؤں میں کہیں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔

جب بہار کا موسم آتا ہے، ہوا ملائم ہوتی ہے، بارش کے حیات بخش قطرات برسنے لگتے ہیں ،دیکھتے ہی دیکھتے پوری طبیعت میں ایک حرکت نمایاں ہو جاتی ہے:سبزے اور پودے اگنے لگتے ہیں،درختوں پر پتے نکل آتے ہیں،کلیاں اور پھول کھل اٹھتے ہیں، پرندے درختوں کی ٹہنیوں پر بیٹھ کر چہچہانے لگتے ہیں اور"محشر" کا شور بپا ہوجاتا ہے۔

اگر موت کے بعد زندگی کے کوئی معنی نہ ہوتے تو ہم ہر سال اپنی آنکھوں کے سامنے ان مناظر کا مشاہدہ نہیں کرتے،اگر موت کے بعد زندگی ایک ناممکن امر اور دیوانگی کی بات ہوتی تو، ہماری آنکھوں کے سامنے اس طرح محسوس صورت میں اس کی ہرگز تکرار نہ ہوتی۔

آخر زمین کے مرنے کے بعد زندہ ہونے اور انسان کے مرنے کے بعد زندہ نے میں کیا فرق ہے؟

۲۔کبھی قرآن مجیدان کا ہاتھ پکڑ کر انھیں ابتدائے خلقت کی طرف لے جاتا ہے،ابتدائی خلقت کی یاد دہانی کراتا ہے،اس صحرائی مرد کی داستان کی طرف اشارہ کرتا ہے جو سڑی گلی ایک ہڈی کا ٹکڑا لے کر پیغمبر

اسلام کی خدمت میں آ گیا اور رچیخ چیخ کر کہنے لگا: "اے محمد! کون اس سڑی ہوئی ہڈی کو پھر سے زندہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے؟ مجھے بتادو کہ کون یہ کام انجام دے سکتا ہے؟" وہ گمان کر رہا تھا کہ مسئلہ معاد کے خلاف ایک دندان شکن دلیل لے آیا ہے۔لیکن قرآن مجید نے پیغمبر اسلام کو یہ فرمانے کا حکم دیا:

قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِيٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ (سورہ یٰس/۷۹)

"آپ کہہ دیجئے کہ جس نے پہلی مرتبہ (بے جان مادہ سے) خلق کیا ہے وہی (پھر سے) زندہ کرے گا"

ابتدائی خلقت اور دوبارہ پیدا کرنے میں کیا فرق ہے؟

لہٰذا دوسری آیات میں ایک بالکل مختصر لیکن بامعنی جملہ میں فرماتا ہے:

كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ (سورہ انبیاء/ ۱۰۴)

"جس طرح ہم نے شروع میں خلق کیا اسی طرح پھر لوٹا دیں گے۔"

۳۔کبھی قرآن مجید وسیع زمین وآسمان کی خلقت کے بارے میں خداوند متعال کی عظیم قدرت کی یاددہانی کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے:

اَوَلَيْسَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ ؕ بَلٰى ۚ وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ ﴿۸۱﴾ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۸۲﴾ (سورہ یٰس/۸۱۔۸۲)

"تو کیا جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان کا مثل دوبارہ پیدا کردے۔یقیناً ہے اور وہ بہترین پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔اس کا امر صرف یہ ہے کہ کسی شے کے بارے میں یہ کہنے کا ارادہ کرلے کہ ہوجا تو وہ شے فوراً ہوجاتی ہے۔"

ان مسائل میں شک وشبہہ کرنے والے، ایسے افراد تھے جن کی فکر کی فضا ان کے چھوٹے سے گھر کی چاردیواری سے زیادہ نہیں تھی، ورنہ وہ جانتے تھے کہ دوبارہ زندہ کرنا ابتدائی خلقت سے آسان اور سادہ تر ہے اور آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے خدا کی قدرت کے مقابلہ میں مردوں کو زندہ کرنا کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔

۴۔قرآن مجید کبھی موت کے بعد زندہ کرنے کی پروردگار کی "طاقتوں" کو ان کی نظروں میں منعکس کر کے فرماتا ہے:

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ الشَّجَرِ الۡاَخۡضَرِ نَارًا فَاِذَاۤ اَنۡتُمۡ مِّنۡہُ تُوۡقِدُوۡنَ﴿۸۰﴾

(سورہ یٰسٓ/۸۰)

"اس نے تمھارے لئے ہرے درخت سے آگ پیدا کردی ہے تو تم اس سے ساری آگ روشن کرتے رہے۔"

یعنی جو خدا ہرے درخت سے آگ پیدا کرسکتا ہے وہ انسانوں کو مرنے کے بعد زندہ کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے۔

جب ہم قرآن مجید کی اس عجیب وغریب تعبیر پر دقت سے غور کرتے ہیں اور جدید سائنس سے مدد لیتے ہیں تو سائمنس ہمیں تباتی ہے: جب ہم کسی درخت کی لکڑی کو جلاتے ہیں تو اس سے جو آگ نکلتی ہے، یہ وہی سورج کی گری اور نور ہے جو سالہا سال سے طاقت (انرجی) کی صورت میں درخت میں ذخیرہ ہوئی ہے۔ہم خیال کرتے تھے وہ نور اور حرارت نابود ہو چکی ہے، لیکن آج دیکھتے ہیں کہ دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں اور حیات کا لباس نو زیب تن کر لئے ہیں۔

کیا اس خدا کے لئے مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا مشکل امر ہے، جو یہ قدرت رکھتا ہے کہ دسیوں سال تک آفتاب کے نور وحرارت کو ایک درخت کے جسم مین ذخیرہ کرے اور ایک لمحہ میں اس حرارت اور نور کو درخت سے بار ہر لے آئے (۱)؟

بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید نے کیسی مستدل اور واضح منطق سے ان لوگوں کا دندان شکن جواب دیکر معاد کے ممکن ہونے کو واضح طور پر ثابت کر دیا ہے، جو مسئلہ میں شک وشبہہ ایجاد کرتے تھے اور حتی کہ معاد کا اعتقاد رکھنے والوں کو دیوانہ کہتے تھے۔

حوالہ جات

۱۔قابل غور بات ہے کہ سائنس (علم نباتات) نے ثابت کیا ہے کہ ہرے درخت سورج کی روشنی سے کاربن ڈائی اوکسائڈ گیس کو جذب کر کے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور کاربن کو اپنے اندر ذخیرہ کرتے ہیں ا

وراوکسیجن کوچھوڑ دیتے ہیں اس کے علاوہ سورج کی توانای (انرجی) کوبھی اپنے اندر ذخیرہ کرتے ہیں۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔مسئلہ معاد سے مشرکین کیوں تعجب کرتے تھے؟

۲۔معاد کے منظر کوہم کیسے ہر سال پودوں میں مشاہدہ کرتے ہیں؟

۳۔قرآن مجید نے اپنی بعض آیات میں جنین کے دوران کومعاد کی ایک نشانی تبائی ہے،اس کی وجہ کیاہے؟

۴۔توانائیوں (انرجیوں) کادوبارہ زندہ ہونا کیاہے؟

۵۔قرآن مجید نے کیوں"الشجر الاخضر"(ہرے درخت) سے استدلال کیاہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

ساتواں سبق: معاد اور تخلیق کا فلسفہ

بہت سے لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ خداوند متعال نے ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے؟

باغبان درخت کو پھل کے لئے لگا تاہے، کسان فصل کاٹنے کے لئے زمین کو کھود کر اس میں کیاریان بنا تاہے اور بیج بوتاہے۔آخر خلقت کے باغبان نے ہمیں کس لئے پیدا کیا ہے؟

کیا خداوند متعال کوکسی چیز کی کمی تھی،جس کی تلافی کے لئے ہمین خلق کیا ہے؟اس صورت میں تو خدا کو محتاج ہونا پڑے گا اور پروردگار کے لئے محتاج ہونا اس کی ذات اور اس کے لامحدود وجود کے شایان شان نہیں ہے۔

مذکورہ سوالات کا جواب مفصل ہے لیکن ان کے جواب چند جملوں میں خلاصہ کر کے واضح کیا جاسکتا ہے:

ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم خداوند متعال کی صفات کا اپنی ذات سے موازنہ کرتے ہیں، چونکہ ہم ایک محدود مخلوق ہیں، اس لئے جو بھی کام انجام دیتے ہیں، اپنی کمی کو پورا کرنے کے لئے ہوتا ہے، ہم سبق پڑھتے ہین تا کہ اپنی علمی کمی کو پورا کریں، کام کرتے ہیں تا کہ اپنی مالی کمی پورا کریں۔علاج ومعالجہ کے پیچھے دوڑتے ہین تا کہ صحت وسلامتی حاصل کریں۔

لیکن خداوند متعال، جو ہر لحاظ سے ایک لامحدود وجود ہے، اگر کوئی کام انجام دے تو ہمیں اس کے مقصد کو اس کے وجود سے باہر جستجو اور تلاش کرنی چاہئے، وہ اس لئے کسی کو پیدا نہیں کرتا ہے تا کہ خود اسے کوئی فائدہ ملے، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ "اپنے بندوں کو نعمتوں سے نوازے"۔

وہ ایک پرنور اور لامحدود سورج ہے، جو کسی احتیاج کے بغیر اپنا نور پھیلا تاہے تا کہ سب اس کے وجود سے مستفید ہوں۔ یہ اس کی لامحدود اور پر برکت و پرفیض ذات کا تقاضا ہے کہ تمام مخلوقات کا ہاتھ پکڑ کر انھیں کمال کے راستہ پر گامزن کرتا ہے۔

ہماری خلقت اپنے عدم سے کمال کی طرف ایک برجستہ قدم تھا خدا کی طرف سے انبیاء کا بھیجنا، آسمانی کتابوں کا نزول اور قوانین واحکام کا معین ہونا، ہر ایک ہمارے کمال کے مراحل شمار ہوتے ہیں یہ دنیا ایک عظیم یونیورسٹی ہے اور ہم اس کے طالب علم ہیں (۱)۔

یہ دنیاایک آمادہ کھیت ہےاور ہم اس کے کسان ہیں (۲)۔

یہ دنیاایک فائدہ بخش تجارتی مرکز ہےاور ہم اس کے تاجر ہیں (۳)۔

ہم کیسے انسان کی خلقت کے لئے کسی مقصد کے قائل نہیں ہو سکتے ؟ حالانکہ جب ہم اپنے اطراف پر نظر ڈالتے ہیں اور مخلوقات کے ذرہ ذرہ پرغور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ذرہ کا ایک مقصد ہے۔

۱، ۲، ۳: نہج البلاغہ: کلمات قصار اور حدیث مشہور" الدنیا مزرعۃ الآخرۃ" کا مضمون۔

ہمارے بدن کے عجیب وغریب کارخانہ میں کوئی بھی چیز بے مقصد نہیں ہے یہاں تک کہ ہمارے آنکھوں کی پلکیں اور ہمارے تلوؤں کی گہرائی بھی بے مقصد نہیں ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارے وجود کا ہر جز کوئی مقصد رکھتا ہو لیکن ہمارا پورا وجود بے مقصد ہو؟

جب ہم اپنے وجود سے باہر آکر اس عظیم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہم اس کائنات میں موجود ہر چیز کو با مقصد پاتے سورج کی روشنی با مقصد ہے، بارش کا برسنا با مقصد ہے اور ہوا کا چلنا بھی با مقصد ہے، لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ پوری کائنات بے مقصد ہو؟!

حقیقت یہ ہے کہ گویا اس عظیم کائنات کے بیچ میں مقصد کی نشاندہی کے لئے ایک بڑا سائن بورڈ نصب کیا گیا ہے، ہم اس کی عظمت کے پیش نظر کبھی پہلے لمحات میں اسے دیکھ نہیں پاتے ہیں اس سائن بورڈ پر یہ عبارت لکھی گئی ہے:" تربیت وتکامل"۔

اب جبکہ ہم اپنی خلقت کے مقصد کے بارے میں کسی حد تک آگاہ ہو گئے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری اس دنیا کی چند دنوں کی زندگی ان تمام مشکلوں، مصیبتوں اور ناکامیوں کے ساتھ ہماری خلقت کا مقصد ہو سکتی ہے؟

فرض کیجئے میں اس دنیا میں ساٹھ سال زندگی بسر کروں، ہر روز صبح سے شام تک روزی کمانے کے لئے کوشش کروں اور شام کو تھکا ہوا گھر لوٹوں، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ میں اپنی پوری عمر میں کئی ٹن غذا اور پانی صرف کروں، بڑی زحمتوں اور محنتوں کے بعد ایک گھر تعمیر کروں، پھر اسے یہیں پر چھوڑ کر اس دنیا سے چلا جاؤں۔ کیا اس مقصد کی یہی اہمیت ہے کہ مجھے درد و رنج سے بھری اس چند روزہ زندگی کی طرف بلایا جائے ؟

اگر ایک انجینئر ،ایک بیابان کے بیچ میں ایک بڑی عمارت تعمیر کرے اور اس کو مکمل کرنے میں اسے برسوں لگ جائیں اور اس عمارت کو مکمل کرنے کے بعد اس میں تمام ساز وسامان فراہم کرے ۔لیکن جب اسے اس عمارت کی تعمیر کے بارے میں سوال کریں کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟ تو وہ جواب میں کہے: میرا مقصد یہ ہے کہ جب تک یہ عمارت اس بیابان میں موجود ہے جو بھی مسافر یہاں سے گزرے، اس میں ایک گھنٹہ آرام کرے! کیا یہ جواب سن کر ہم سب تعجب سے یہ نہیں کہیں گے: ایک مسافر کے ایک گھنٹہ آرام کے لئے اس قدر زحمتوں اور محنتوں کی ضرورت نہیں تھی!

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ قیامت اور موت کے بعد والی زندگی کا عقیدہ نہیں رکھتے ہیں وہ اس دنیا کی زندگی کو فضول سمجھتے ہیں ۔مادہ پرستوں کی زبان سے یہ جملہ اکثر سنا گیا ہے کہ اس دنیا کی زندگی بے مقصد ہے ۔حتی بعض اوقات ان میں سے کچھ افراد خودکشی کر لیتے ہیں کیونکہ وہ اس دنیا کی مادی اور مکرر اور بے مقصد زندگی سے تنگ آجاتے ہیں۔

جو چیز زندگی کو مقصد بخشتی ہے اور اسے معقول اور با حکمت بناتی ہے وہ یہ ہے کہ اس زندگی کو دوسری دنیا کے لئے مقدمہ سمجھا جائے اور اس زندگی کے مشکلات کو برداشت کرنا اور اس کے لئے اتنے دکھ درد اٹھانا ایک ابدی زندگی کی راہ میں استفادہ کرنے کے لئے ہو۔

یہاں پر اس دلچسپ مثال کا پھر سے ذکر کرنا مناسب ہوگا جسے ہم نے اس سے پہلے بیان کیا ہے، یعنی اگر ماں کے شکم میں موجود جنین صاحب عقل وشعور ہوتا اور اس سے کہا جاتا: "تیری اس زندگی کے بعد کوئی خبر نہیں ہے،" تو وہ اپنی زندگی پر اعتراض کرتے ہوئے کہتا: "پس اس کا کیا مطلب ہے کہ میں اس جگہ قیدی بنا رہوں؟ خون پیتا رہوں اور ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے ایک کونے میں پڑا رہوں اور اس کے بعد کچھ نہ ہو؟ پروردگار کا میری اس خلقت سے کیا مقصد تھا؟!" لیکن اگر اسے اطمینان دلایا جائے کہ یہ چند مہینے جلدی گزرنے والے ہیں اور یہ دنیا میں نسبتاً ایک طولانی زندگی کی آمادگی کا دور ہے، وہ دنیا اس جنین کے ماحول سے بہت زیادہ وسیع، پرنور اور باشکوہ ہے اور اس کی نسبت زیادہ نعمتوں سے مالا مال ہے۔" اس وقت وہ مطمئن ہوجائے گا کہ اس کا جنینی دوران ایک بامعنی وبا مقصد دور ہے اسی لئے قابل برداشت ہے۔

قرآن مجید سورہ واقعہ آیت نمبر ۶۲ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَلَقَدۡ عَلِمۡتُمُ النَّشۡاَةَ الۡاُوۡلٰى فَلَوۡلَا تَذَكَّرُوۡنَ ﴿۶۲﴾

"اورتم پہلی خلقت کوتو جانتے ہوتو پھراس میں غور کیوں نہیں کرتے ہو؟ (کہ اس کے بعد بھی ایک جہان ہے)۔"

مختصر یہ کہ یہ دنیا اپنے تمام وجود سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کے بعد ایک اور دنیا ہے ورنہ یہ دنیا فضول، بیہودہ اور بے معنی ہوتی۔

اس بات کوقرآن مجید کی زبانی سنئے کہ سورہ مومنون کی آیت نمبر ۱۱۵ میں ارشادفرماتا ہے:

اَفَحَسِبۡتُمۡ اَنَّمَا خَلَقۡنٰكُمۡ عَبَثًا وَّاَنَّكُمۡ اِلَيۡنَا لَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۱۱۵﴾

"کیا تمھارا خیال یہ تھا کہ ہم نے تمھیں بیکار پیدا کیا اور تم ہماری طرف پلٹا کر نہیں لائے جاؤ گے؟"

اس کا اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ اگر "معاد" (جس کی تعبیر قرآن مجید میں خدا کی طرف پلٹنا ہے) کا وجود نہ ہوتا تو انسان کی خلقت عبث اور بیہودگی کے برابر ہوتی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ خلقت کا فلسفہ کہتا ہے: اس عالم کے بعد ایک اور عالم کا وجود ضروری ہے۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔خدا کی صفات کا مخلوق کی صفات سے کیوں موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے؟

۲۔ ہماری خلقت کا مقصد کیا ہے؟

۳۔کیا اس دنیا کی زندگی انسان کی خلقت کا مقصد ہوسکتی ہے۔

۴۔جنین کی زندگی کا اس دنیا کی زندگی سے موازنہ ہمیں کیا سکھاتا ہے؟

۵۔قرآن مجید اس دنیا کی تخلیق سے آخرت کے وجود پر کیسے استدلال کرا ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

آٹھواں سبق

روح کی بقاء، قیامت کی ایک علامت

کوئی شخص نہیں جانتا ہے کہ انسان کب سے "روح" کے وجود کے بارے میں فکر کرنے لگا ہے۔

صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ انسان ابتداء سے ہی اپنے اور اس دنیا کی دوسری مخلوقات کے درمیان فرق کا مشاہدہ کرتا رہا ہے، اپنے اور پتھر، لکڑی، پہاڑ اور صحرا کے درمیان فرق، اپنے اور حیوانات کے درمیان فرق۔

انسان نے خواب کی حالت کو دیکھا تھا، اسی طرح اس نے موت کی حالت کو بھی دیکھا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ خواب اور موت کے دوران بغیر اس کے کہ جسم و مادہ میں کوئی تبدیلی ایجاد ہو اس کی حالت میں ایک عظیم تغیر و تحول پیدا ہوتا ہے، یہیں سے اس نے سمجھا کہ اس جسم کے علاوہ ایک اور گوہر بھی اس کے اختیار میں ہے۔

اس کے علاوہ وہ دیکھ رہا تھا کہ حیوانات سے بھی فرق رکھتا ہے، کیونکہ وہ فیصلے لینے میں اختیار و آزادی کا مالک ہے، جبکہ حیوانات کی نقل و حرکت فطری اور جبری ہے۔

بالخصوص نیند کی حالت میں جب اس کے بدن کے تمام اعضاء ایک کونے میں خاموش پڑے ہوتے تھے اور وہ خواب میں مختلف مناظر کا مشاہدہ کرتا تھا تو اس بات کی گواہی دیتا تھا کہ ایک مخفی اور پُر اسرار طاقت اس کے وجود پر حکم فرما ہے، تو اس نے اس کا نام "روح" رکھا۔

جب عالم بشریت کے مفکرین نے فلسفہ کی بنیاد ڈالی تو "روح" ایک اہم فلسفی مسئلہ کے عنوان سے دوسرے مسائل کی فہرست میں قرار پائی۔ اس کے بعد تمام فلاسفہ نے اس کے بارے میں اپنے نظریات پیش کئے، یہاں تک کہ بعض اسلامی علماء کے کہنے کے مطابق، روح کی حقیقت اور اس سے مربوط دوسرے مسائل کے بارے میں تقریباً "ایک ہزار اقوال و نظریات" پیش کئے گئے ہیں۔ یہ ایک لمبی بحث ہے، لیکن جس اہم مطلب کو جاننا ضروری ہے، وہ اس سوال کا جواب ہے:

کیا روح مادہ ہے یا غیر مادہ؟ دوسرے الفاظ میں: کیا روح مستقل ہے یا مغز و اعصاب کے سلسلہ کے مادی اور کیمیاوی خصوصیات میں سے ہے؟

بعض مادی فلاسفہ اس بات پر مصر ہیں کہ روح اور اس سے متعلق مظاہر بھی مادی ہیں اور مغز کے خلیوں کے خواص میں سے ہیں، اور جب انسان مرتا ہے تو اس کے ساتھ روح بھی نابود ہوجاتی ہے، بالکل اسی طرح کہ ایک گھڑی پر ہتھوڑی مار کر اسے توڑ دیا جائے تو اس گھڑی کا چلنا بھی بند ہوجاتا ہے!

اس گروہ کے مقابلہ میں الٰہی فلاسفہ ہیں، حتی بعض مادی فلاسفہ بھی جو روح کی حقیقت کے قائل ہیں، وہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ بدن کے مرنے سے روح نہیں مرتی بلکہ وہ باقی رہتی ہے۔

اس مسئلہ، یعنی روح کی حقیقت، استقلال اور بقاء کو ثابت کرنے کے لئے کافی اور پیچیدہ دلائل پیش کی گئی ہیں کہ ہم یہاں پر ان میں سے بعض واضح ترین دلائل کو آسان اور روان عبارتوں میں اپنے عزیز نوجوانوں کی آگاہی کے لئے بیان کرتے ہیں:

۱۔ایک وسیع کائنات ایک چھوٹی جگہ میں نہیں سما سکتی

فرض کیجئے آپ ایک عظیم سمندر کے کنارے بیٹھے ہیں ۔اس کے ساحل پر سر بفلک پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے۔ پانی کی گرجتی لہریں مسلسل ساحلی چٹانوں سے ٹکراتی ہیں اور غیض وغضب کی حالت میں سمندر کی طرف پلٹ جاتی ہیں۔

پہاڑ کے دامن میں واقع بڑی بڑی چٹانیں بتارہی ہیں کہ پہاڑوں پر کیا غوغا ہے، نیلگوں آسمان بھی اس پہاڑ اور سمندر پر خیمہ لگائے ہوئے ہے اور رات کے وقت اپنی عظمت وشکوہ کا مظاہرہ کررہا ہے۔

ہم ایک لمحہ اس منظر کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے اس منظر کو اپنے ذہن میں اسی شان وشوکت اور عظمت کے ساتھ مجسم کرتے ہیں۔

بے شک اس ذہنی نقشہ اور اس عظیم منظر اور تصور کے لئے ایک مناسب جگہ کی ضرورت ہے، ممکن نہیں ہے کہ یہ نقشہ مغز کی چھوٹی خلیوں میں سما سکے، اگر ایسا ہو تو ایک بڑا نقشہ ایک چھوٹے سے نقطہ پر سمائے گا (جو محال ہے)، جبکہ ہم اس نقشہ کو اس کی تمام عظمتوں کے ساتھ اپنے ذہن میں احساس کرتے ہیں۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ہم جسم اور مغز کی خلیوں کے علاوہ ایک اور گوہر رکھتے ہیں اور ہر اندازہ کے نقشہ کو اپنے اندر منعکس کرسکتا ہے، یقینا یہ گوہر عالم مادہ سے ماوراء ہے، کیونکہ مادی دنیا میں ہمیں ایسی چیز نہیں ملتی ہے۔

۲۔بیرونی دنیا میں روح کے انعکاس کی خصوصیت

ہم اپنے وجود کے اندر بہت سی طبیعیاتی اور کیمیاوی خاصیتیں رکھتے ہیں،معدہ اور دل کی حرکتیں طبیعیاتی عمل ہیں،لیکن آب دہن اور معدہ کی رطوبت کا غذا پر اثر ایک کیمیاوی عمل ہے۔اور اس قسم کے عوامل ہمارے پورے جسم میں فراواں صورت میں پائے جاتے ہیں۔

اگر روح،سوچ اور فکر سب مغز کی خلیوں کی مادی،طبیعیاتی اور کیمیاوی خصوصیتیں ہیں،تو ان میں اور ہمارے جسم کی دوسری خصوصیتوں میں کیوں فرق پایا جاتا ہے؟

فکر واندیشہ اور روح بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارے رابطہ اور پیوند کو برقرار کرتی ہیں اور ہمارے ارد گرد گزرنے والے حالات سے ہمیں آگاہ کرتی ہیں،لیکن لعاب دہن اور معدہ کی رطوبت کی کیمیائی خصوصیتیں اور آنکھ،زبان،اور دل کی طبیعیاتی حرکتیں ہرگز یہ حالت نہیں رکھتی ہیں۔

دوسرے الفاظ میں،ہم بخوبی احساس کرتے ہیں کہ ہمارا وجود بیرونی دنیا سے

مربوط ہے،اور ہم اس کے مسائل سے آگاہ ہیں،کیا بیرونی دنیا ہمارے اندر داخل ہوتی ہے؟یقینا نہیں،پس مسئلہ کیا ہے؟

یقینا بیرونی دنیا کا نقشہ ہمارے پاس آتا ہے اور ہم روح کی بیرونی منظر کشی کی خصوصیت سے استفادہ کے ذریعہ اپنے وجود سے باہر والی دنیا کے بارے میں آگاہ ہوتے ہیں اور یہ خصوصیت ہمارے جسم کے کسی بھی طبیعیاتی اور کیمیائی حصہ میں موجود نہیں ہے۔(غور کریں)

دوسری عبارت میں:بیرونی اور عینی مخلوقات سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے ان پر ایک قسم کا تسلط اور حاوی ہونا ضروری ہے۔یہ کام مغز کی خلیوں کا نہیں ہے،مغز کی خلیے صرف باہر سے متأثر ہوسکتی ہیں،جس طرح جسم کی دوسری خلیے متأثر ہوتی ہیں۔

اس فرق سے واضح ہوجاتا ہے کہ یہاں پر طبیعیاتی اور کیمیائی تبدیلیوں کے علاوہ ایک اور حقیقت کا وجود ہے جو ہمیں اپنے وجود سے باہر والی دنیا پر مسلط اور حاوی کرتی ہے اور یہ"روح"کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں ہے،جو مادی دنیا اور مادہ کی خصوصیات سے بالاتر ہے۔

۳۔روح کے حقیقی اور مستقل ہونے پر تجرباتی دلائل

خوش قسمتی سے آج دنیا کے دانشوروں اور سائنسدانوں نے مختلف علمی اور تجربی طریقوں سے روح کی حقیقت اور اس کے مستقل ہونے کو ثابت کیا ہے اور ان لوگوں کا دانداں شکن جواب دیا ہے جو روح کے مستقل ہونے کے منکر ہیں اور اسے مادہ کی خصوصیات سے نیز اس کا تابع جانتے ہیں۔

ا۔مقناطیسی خواب (ہپنوٹزم یا میگنیٹزم) ان محکم دلائل میں سے ہیں جو بہت سے تجربوں کے بعد ثابت ہوئے ہیں۔بہت سے لوگوں نے انھیں دیکھا ہے،جن لوگوں نے ان کو نہیں دیکھا ہے،ان کے لئے تھوڑی سی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ ہے:

کچھ افراد مختلف علمی طریقوں سے کسی اور شخص کے ذریعہ نیند میں چلے جاتے ہیں،کسی کو نیند میں ڈالنے والے کو"عامل" کہا جاتا ہے اور نیند میں چلا جانے والا"میڈیم" کہلاتا ہے۔"میڈیم"شخص تلقین،فکری تمرکز،اور آنکھ کی مقناطیسی قوت جیسی چیزوں کے ذریعہ ایک گہری نیند میں چلا جاتا ہے،لیکن یہ نیند عام نیند کے مانند نہیں ہوتی ہے،بلکہ یہ ایک ایسی نیند ہوتی ہے جس میں سونے والے (میڈیم) سے رابطہ برقرار کیا جاسکتا ہے،اس سے بات کی جاسکتی ہے اور اس کا جواب سنا جاسکتا ہے۔

اسی حالت میں روح سونے والے کو مختلف جگہوں پر بھیجتی ہے،کبھی وہ وہاں سے اپنے ساتھ تازہ خبریں لے آتا ہے اور ایسے مسائل کی اطلاع حاصل کرتا ہے،جن کے بارے میں عام حالت میں اسے کوئی خبر نہیں ہوتی ہے۔

کبھی اس حالت میں ریاضی کے پیچیدہ ترین سوال حل کرتا ہے۔

کبھی اس مقناطیسی نیند کے دوران اپنی مادری زبان کے علاوہ ایک ایسی زبان میں بات کرتا ہے ،جس سے وہ کبھی آشنا نہیں تھا۔

کبھی کسی مقفل صندوق میں رکھے ہوئے کاغذ پر کچھ مطالب وہ لکھ دیتا ہے۔

حتی کہ کبھی ارواح ،شبح (دور سے نظر آنے والے جسم) کی صورت میں اور کبھی واضح سایوں کی صورت میں اس قسم کے اجتماعات میں ظاہر ہوتی ہیں۔ان کی تفصیل ہم نے کتاب"عود ارواح" میں بیان کی ہے۔

۲۔"اسپرٹزم" یا"موت کے بعد ارواح سے ارتباط" روح کی حقیقت اور استقلال کی

ایک دلیل ہے۔

اس وقت بھی "روحیون کی جماعتوں" کے نام سے دنیا بھر میں کچھ ایسے افراد موجود ہیں۔جن کے بارے میں مصری دانشور "فرید وجدی" کا کہنا ہے کہ ان کی طرف سے تقریبا تین سو رسالے اور روزنامے دنیا بھر میں شائع ہوتے ہیں۔مختلف شخصیتوں پر مشمل معروف افراد ان کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں اور ان کے سامنے ارواح سے رابطہ قائم کیا جاتا ہے اور اس کے علاوہ بہت سے غیر معمولی کام بھی انجام دئے جاتے ہیں۔

اگرچہ بعض فریب کار، روح سے ارتباط کے مسئلہ کے بارے میں کسی قسم کا علم رکھے بغیر لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے ارواح سے رابطہ کا دعوی کرتے ہیں اور اس طرح اس سے کافی حد تک ناجائز فائدہ اٹھا تے ہیں۔لیکن یہ فریب کاری اس حقیت کے سلسلہ میں کوئی رکاوٹ نہیں بن سکتی ہے یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا بڑے بڑے محققین نے اعتراف کیا ہے اور وہ ارواح کے ساتھ رابطہ کا ممکن ہونا ہے(۱)۔

یہ سب انسان کی روح کی حقیقت، اس کے استقلال اور مرنے کے بعد باقی رہنے کی دلیل ہے، اور معاد اور موت کے بعد زندگی کی حقیقت کے سلسلہ میں ایک مؤثر قدم ہے۔

۳۔وہ خواب جو ہم دیکھتے ہیں اور خواب کی حالت میں ہمارے سامنے مجسم ہونے والے مناظر کبھی مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث سے پردہ اٹھاتے ہیں اور پوشیدہ مسائل کو آشکار کرتے ہیں، ان کو ہم محض اتفاق نہیں کہہ سکتے، بلکہ یہ بھی روح کی حقیقت واستقلال کی ایک اور دلیل ہیں۔

اکثر افراد نے اپنی زندگی میں سچے خواب دیکھے ہیں اس کے علاوہ سنتے آئے ہیں کہ فلاں دوست نے ایک ایسا خواب دیکھا ہے کہ ایک مدت کے بعد کسی کمی بیش کے بغیر اس کی تعبیر سچ نکلی ہے۔اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی روح کا خواب کی

۱۔اس کی مزید وضاحت کے لئے کتاب "عود ارواح" اور کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع فرمائیں۔

حالت میں دوسرے عوالم سے رابطہ ہوتا ہے اور وہ کبھی مستقبل میں رونما ہونے والے حوادث کا مشاہدہ کرتی ہے۔

مجموعی طور پر یہ امور بخوبی ثابت کرتے ہیں کہ روح مادی نہیں ہے اور یہ انسان کے مغز کی طبیعیاتی اور

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

کیمیائی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ یہ ماورائے طبیعت ایک حقیقت ہے جو اس جسم کے مرنے سے نابود نہیں ہوتی ہے اور یہ امور بذات خود مسئلہ معاد اور موت کے بعد عالم آخرت کو ثابت کرنے کے لئے راہ کو ہموار کرتی ہیں۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔روح کے مسئلہ میں الٰہی فلاسفہ اور مادی افراد کے درمیان کیا فرق ہے؟

۲۔روح کی حقیقت کی ایک دلیل "بڑی چیز کا چھوٹی جگہ میں نہ سمانا ہے" اس سے مراد کیا ہے؟

۳۔"مقناطیسی خواب" کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

۴۔ارواح کے ساتھ ارتباط سے کیا مراد ہے؟

۵۔سچے خواب کس طرح روح کی حقیقت اور استقلال کی دلیل ہے؟

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

نواں سبق: جسمانی اور روحانی معاد

معاد کی بحث میں پیش آنے والے اہم سوالات یہ ہیں کہ کیا "معاد" صرف روحانی پہلو رکھتی ہے یا انسان کا جسم و بدن بھی دوسری دنیا میں لوٹ آئے گا؟ اور انسان اسی دنیوی روح وجسم کے ساتھ صرف بلند تر درجہ کے ساتھ دوسری دنیا میں زندگی کو جاری رکھے گا؟

پرانے زمانہ کے بعض فلاسفہ صرف روحانی معاد کے قائل تھے اور جسم کو ایک ایسا مرکب جانتے تھے جو صرف اس دنیا سے مربوط ہے اور موت کے بعد انسان اس کا محتاج نہیں ہوگا، اسے چھوڑ کر عالم ارواح میں پرواز کرے گا۔

لیکن اسلام کے عظیم علما اور بہت سے فلاسفہ کا عقیدہ یہ ہے کہ معاد دونوں صورتوں میں یعنی "روحانی" و"جسمانی" ہوگی۔ صحیح ہے کہ یہ جسم خاک بن جائے گا اور یہ خاک زمین میں پراگندہ ہوکر گم ہوجائے گی، لیکن پروردگار قادر وعالم ان تمام ذرات کو قیامت کے دن دوبارہ اکٹھا کر کے انھیں زندگی بخشے گا اور اس موضوع کو "جسمانی معاد" کہا جاتا ہے، کیونکہ روح کے پھر سے لوٹنے کو قطعی سمجھا گیا ہے اور چونکہ بحث صرف جسم کے لوٹنے کی ہے، یہ نام اسی عقیدہ کے لئے رکھا گیا ہے۔

بہر حال معاد سے متعلق، قرآن مجید میں مختلف اور کافی تعداد میں موجود آیات بھی "جسمانی معاد" پر دلالت کرتی ہیں۔

جسمانی معاد پر قرآنی شواہد

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک صحرائی عرب نے ایک بوسیدہ ہڈی کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلمکی خدمت میں پیش کر کے سوال کیا تھا کہ کون اسے پھر سے زندہ کرسکتا ہے؟ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خدا کے حکم سے جواب دیا تھا کہ وہی خدا اسے پھر سے زندہ کرسکتا ہے جس نے اسے پہلے خلق کیا ہے، وہی جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے اور سبزے درخت سے آگ نکالی ہے۔ اس واقعہ سے مربوط آیات سورہ یٰسں کی آخر میں آئی ہیں۔

قرآن مجید کا دوسری جگہ پر ارشاد ہے:

"تم لوگ قیامت کے دن قبروں سے باہر آؤ گے۔" (سورہ یٰس/۵۱، قمر/۷)

ہم جانتے ہیں کہ قبریں خاک شدہ جسموں کی جگہ ہیں نہ روح کی۔

بنیادی طور پر معاد کے منکروں کا تعجب اس بات پر تھا کہ وہ کہتے تھے: "جب ہم خاک میں تبدیل ہوجائیں گے اور یہ خاک پراگندہ ہوجائے گی تو ہم کیسے پھر سے زندہ ہوجائیں گے؟"

وَقَالُوٓا ءَإِذَا ضَلَلۡنَا فِي ٱلۡأَرۡضِ ءَإِنَّا لَفِي خَلۡقٖ جَدِيدِۭۚ (سورہ سجدہ/۱۰)

اور یہ کہتے ہیں کہ اگر ہم زمین میں گم ہوگئے تو کیا نئی خلقت میں پھر ظاہر کئے جائیں گے؟"

قرآن مجید جواب میں ارشاد فرماتا ہے:

أَوَلَمۡ يَرَوۡاْ كَيۡفَ يُبۡدِئُ ٱللَّهُ ٱلۡخَلۡقَ ثُمَّ يُعِيدُهُۥٓۚ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ يَسِيرٞ ﴿١٩﴾

(سورہ عنکبوت/۱۹)

"کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ خدا کس طرح مخلوقات کو ایجاد کرتا ہے اور پھر دوبارہ واپس لے جاتا ہے، یہ سب اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔"

ایک عرب جاہل کہتا تھا:

أَيَعِدُكُمۡ أَنَّكُمۡ إِذَا مِتُّمۡ وَكُنتُمۡ تُرَابٗا وَعِظَٰمًا أَنَّكُم مُّخۡرَجُونَ ﴿٣٥﴾

(سورہ مومنون/ ۳۵)

"کیا یہ تم سے اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ جب تم مرجاؤ گے اور ہڈی ہوجاؤ گے تو پھر دوبارہ نکالے جاؤ گے؟"

قرآن مجید کی مذکورہ تمام تعبیرات اور اس موضوع سے متعلق دوسری آیات واضح طور پر دلالت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر جگہ پر "جسمانی معاد" کی بات کرتے تھے اور تنگ نظر مشرکین کا تعجب بھی اسی بات پر تھا۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ قرآن مجید اسی جسمانی معاد کے چند نمونوں کو نباتات وغیرہ کے سلسلہ میں پیش کر کے ان کے لئے تشریح فرماتا ہے اور ابتدائی خلقت اور خدا کی قدرت کو شاہد کے طور پر پیش کرتا ہے۔

اس لئے ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص مسلمان ہو اور قرآن مجید سے تھوڑی سی واقفیت رکھتے ہوئے

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

جسمانی معاد کا منکر ہو۔قرآن مجید کی نظر میں جسمانی معاد کا انکار اصل معاد کے انکار کے برابر ہے۔

عقلی شواہد

اس کے علاوہ عقل بھی کہتی ہے کہ روح اور بدن الگ الگ حقیقتیں نہیں ہیں ، یہ دونوں مستقل ہونے کے باوجود آپس میں پیونداور رابطہ رکھتے ہیں، دونوں ایک ساتھ نشوونما پاتے ہیں،اور یقیناابدی اور جاودانی زندگی کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔

اگر چہ دونوں (روح اور بدن) برزخی مدت (دنیا وآخرت کے درمیان فاصلہ) کے دوران کچھ مدت تک ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں،لیکن ہمیشہ کے لئے یہ دوری ممکن نہیں ہے۔جس طرح روح کے بغیر جسم ناقص ہے اسی طرح روح بھی جسم کے بغیر ناقص ہے۔روح حکم فرما اور عامل حرکت ہے اور بدن فرمانبردار اور وسیلہ عمل ہے،کوئی بھی حکم فرما،فرمانبردار سے اور کوئی بھی ہنرمند وسیلہ عمل سے بے نیاز نہیں ہوتا ہے۔

چونکہ آخرت میں روح اس دنیا کی نسبت ایک بلند تر سطح پر قرار پائے گی اس لئے اسی نسبت سے جسم کو بھی کمال حاصل کرنا چاہئے ،اور ضرور ایسا ہی ہوگا،یعنی انسان کا جسم قیامت کے دن اس دنیا کی فرسودگی ،عیوب اور نقائص سے خالی ہوگا۔

بہرحال جسم و روح ایک دوسرے کی ہمزاد اور مکمل کرنے والے ہیں اور معاد صرف روحانی یا صرف جسمانی نہیں ہوسکتی ہے۔دوسرے الفاظ میں جسم وروح کی خلقت اوران کے آپسی رابطہ اور پیوند کی حالت کا مطالعہ اس بات کی ایک واضح دلیل ہے کہ معاد جسمانی وروحانی دونوں صورتوں میں واقع ہوگی۔

دوسری طرف انصاف وعدالت کا قانون بھی یہی کہتا ہے : معاد دونوں پہلوؤں سے (جسمانی وروحانی) ہونی چاہئے ۔کیونکہ اگر انسان کسی گناہ کا مرتکب ہوا ہے۔تو اس نے اس گناہ کو اس روح اور جسم کے ذریعہ انجام دیا ہے،اور اگر اس نے کوئی نیک کام انجام دیا ہے تو وہ بھی اس جسم وروح سے انجام دیا ہے اس لئے اس کی جزااور سزا بھی اسی روح اور بدن کو ملنی چاہئے۔اگر صرف جسم ہی پلٹے گا یا صرف روح ہی پلٹے گی اوران میں سے صرف ایک ہی کو جزا یا سزا ملے گی،تو عدل وانصاف کا قانون نافذ نہیں ہوگا۔

جسمانی معاد سے متعلق چند سوالات

دانشوروں نے اس سلسلہ میں متعدد سوالات پیش کئے ہیں کہ بحث کو مکمل کرنے کے لئے ان میں سے بعض کا ذکر جواب کے ساتھ ضروری ہے:

۱۔علوم طبیعیات (natural sciences) کے دانشوروں کی تحقیقات کے مطابق، انسان کا بدن اس کی پوری عمر کے دوران کئی بار تبدیل ہوتا ہے۔اس کی مثال اس پانی کے حوض جیسی ہے، جس میں ایک طرف سے پانی داخل ہوتا ہے اور دوسری طرف سے رفتہ رفتہ باہر نکلتا ہے ظاہر ہے کہ ایک مدت کے بعد اس حوض کا پورا پانی تبدیل ہو جاتا ہے۔

انسان کے بدن میں یہ صورت احتمالاً ہر سات سال کے بعد ایک بار پیش آتی ہے، اس لئے انسان کا بدن اس کی پوری حیات کے دوران کئی بار تبدیل ہوتا ہے!

اب یہ سوال پیداا ہوتا ہے کہ انسان کے جسموں میں سے کون سا جسم قیامت کے دن لوٹے گا؟

اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں: ان میں سے انسان کا آخری بدن لوٹے گا، جیسا کہ مذکورہ آیات میں ہم نے پڑھا کہ خداوند متعال انسانوں کو ان ہی پوسیدہ اور خاک شدہ ہڈیوں سے دوبارہ زندہ کرے گا۔اور اس بات کے یہ معنی ہیں کہ انسان کا آخری بدن لوٹے گا، اسی طرح قبروں سے مردوں کے اٹھ کر نکلنے سے بھی آخری بدن کے زندہ ہونے کے معنی نکلتے ہیں۔

لیکن اہم نکتہ یہ ہے کہ انسان کا آخری بدن اپنے اندر وہ تمام آثار اور خصوصیات محفوظ رکھتا ہے جو اس کی پوری عمر میں مختلف بدن رکھتے تھے۔

دوسرے الفاظ میں: جو بدن تدریجاً نابود ہوتے ہیں۔وہ اپنے آثار وخصوصیات کو آنے والے دوسرے بدن میں منتقل کرتے ہیں، اس لئے آخری بدن گزشتہ تمام بدنوں کا وارث ہوتا ہے اور عدل وانصاف کے قانون کے تحت تمام جزاوسزا کا مستحق قرار پاسکتا ہے۔

۲۔کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم خاک میں تبدیل ہو جائیں گے اور ہمارے بدن کے ذرات پودوں اور میووں میں تبدیل ہو جائیں گے، اور نتیجہ کے طور پر دوسرے انسان کے بدن کے جزو بن جائیں گے تو قیامت کے دن کیا ہوگا؟ (یہ وہی چیز ہے جسے فلسفہ وکلام کے علم میں "شبہئہ آکل وما کول" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے)

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اگرچہ اس سوال کا جواب تفصیلی بحث کا حامل ہے، لیکن ہم ایک مختصر عبارت میں ضرورت بھر اس پر بحث کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے: جس انسان کے بدن کے ذرات خاک میں تبدیل ہونے کے بعد دوسرے بدن میں منتقل ہوتے ہیں، وہ یقیناً پہلے بدن میں واپس آجاتے ہیں۔ (مذکورہ آیات بھی اس دعویٰ کی واضح شاہد ہیں)

یہاں پر بظاہر جو مشکل نظر آتی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ دوسرا بدن ناقص ہو جائے گا۔

لیکن حقیقت میں یہ دوسرا بدن ناقص نہیں ہوتا ہے بلکہ چھوٹا ہوتا ہے، چونکہ یہ ذرات تمام بدن میں پھیلے ہوئے تھے، جب اس سے واپس لئے جاتے ہیں تو وہ بدن اسی نسبت سے ضعیف اور چھوٹا ہو جاتا ہے۔

اس لئے نہ پہلا بدن نابود ہوتا ہے اور نہ دوسرا بدن، صرف جو چیز یہاں پر وجود میں آتی ہے وہ دوسرے بدن کا چھوٹا ہونا ہے اور یہ امر بھی کوئی مشکل پیدا نہیں کرتا ہے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ قیامت کے دن تمام بدن کمال حاصل کریں گے، اور نقائص اور کمیاں دور ہو جائیں گی، جس طرح ایک بچہ نشو و نما پاتا ہے۔ یا ایک زخمی کے زخم میں نئے سرے سے گوشت بھر جاتا ہے اور اس کی شخصیت میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح قیامت کے دن چھوٹے اور ناقص بدن مکمل صورت میں زندہ ہوں گے، کیونکہ قیامت عالم کمال ہے۔

اس طرح اس سلسلہ میں کوئی مشکل باقی نہیں رہتی ہے (غور کیجئے۔ مزید وضاحت کے لئے کتاب "معاد و جہان پس از مرگ" کی طرف رجوع کیجئے)۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ کیا قیامت کے دن انسان کی زندگی ہر لحاظ سے اس دنیا جیسی زندگی ہے؟

۲۔ کیا ہم قیامت کے دن جزا و سزا کو اس دنیا میں بالکل درک کر سکتے ہیں؟

۳۔ کیا بہشت کی نعمتیں اور جہنّم کے عذاب صرف جسم سے مربوط ہیں۔

۴۔ اعمال کے مجسم ہونے سے مراد کیا ہے اور قرآن مجید نے اس سلسلہ میں کیسے دلالت کی ہیں؟

۵۔ اعمال کے مجسم ہونے کا عقیدہ معاد کی بحث کی کن مشکلات کا جواب دیتا ہے۔

دسواں سبق: جنّت، جہنّم اور تجسّم اعمال

بہت سے لوگ اپنے آپ سے یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا موت کے بعد عالم آخرت بالکل اسی دنیا کے مانند ہے یا اس سے فرق رکھتا ہے؟ کیا اس عالم کی نعمتیں، سزائیں، اور مختصر یہ کہ اس پر حکم فرما نظام اور قوانین اسی دنیا جیسے ہیں؟

اس کے جواب میں واضح طور پر کہنا چاہئے کہ ہمارے پاس بہت سے ایسے شواہد موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا اور اس دنیا میں کافی فرق ہے، حتی کہ اس حد تک فرق ہے کہ جو کچھ ہم اس دنیا کے بارے میں جانتے ہیں وہ ایک ایسی سیاہی جسم کے مانند ے جسے ہم دور سے دیکھتے ہیں۔

بہتر ہے کہ ہم اس سلسلہ میں اسی "جنین" والی مثال سے استفادہ کریں: جس قدر "جنین" کی دنیا اور اس دنیا میں فرق ہے، اسی قدر یا اس سے زیادہ اس دنیا اور دوسری دنیا کے درمیان فرق ہے۔

اگر ماں کے شکم (عالم جنین) میں موجود بچہ عقل و شعور رکھتا اور باہر کی دنیا، آسمان، زمین، چاند، سورج، ستاروں، پہاڑوں، جنگلوں اور سمندروں کے بارے میں ایک صحیح تصویر کشی کرنا چاہتا تو وہ ہرگز یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔

عالم جنین میں موجود بچہ جس نے اپنی ماں کے انتہائی محدود شکم کے علاوہ کچھ نہین دیکھا ہے، اس کے لئے اس دنیا کے چاند، سورج، سمند، امواج، طوفان، باد نسیم، اور پھولوں کی خوبصورتی کا کوئی مفہوم و معنی نہیں ہے، اس کی لغت کی کتاب صرف چند الفاظ پر مشتمل ہے۔ اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ ماں کے شکم کے باہر سے کوئی اس سے بات کرے تو وہ ہرگز اس کی بات کے معنی تک نہیں سمجھ سکتا ہے۔

اس محدود دنیا اور اس دوسری وسیع دنیا کے درمیان فرق ایسا ہی یا اس سے زیادہ ہے، لہذا ہم کبھی دوسری دنیا کی نعمتوں اور بہشت برین کی حقیقت کے بارے میں ہرگز آگاہ نہیں ہو سکتے ہیں۔

اسی وجہ سے ایک حدیث میں آیا ہے:

"فیھا مالا عین رائت ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر"

"بہشت میں ایسی نعمتیں ہیں کہ جنھیں کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہے، کسی کان نے نہیں سنا ہے اور نہ کسی کے دل میں ان کا تصور پیدا ہوا ہے۔"

قرآن مجید اسی مطلب کو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ ۚ جَزَآءً ۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٧﴾ (سورہ سجدہ/۱۷)

"پس کسی نفس کو نہیں معلوم ہے کہ اس کے لئے (وہاں پر) کیا کیا خنکی چشم کا سامان چھپا کر رکھا گیا ہے جو ان کے اعمال کی جزا ہے۔"

اس دنیا پر حکم فرما نظام بھی اس دنیا کے نظام سے کافی فرق رکھتا ہے، مثلاً: قیامت کی عدالت میں انسان کے ہاتھ، پاؤں، اس کے جسم کی جلد اور یہاں تک کہ جس زمین پر گناہ یا ثواب انجام دیا ہے اس کے اعمال کے گواہ ہوں گے:

قرآن مجید میں سورہ یٰس کی آیت نمبر ۶۵ میں ارشاد ہوا ہے:

اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾

"آج ہم ان کے منہ پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ بولیں گے اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ کیسے اعمال انجام دیا کرتے تھے۔"

دوسری جگہ پر سورہ فصلت کی آیت نمبر ۲۱ میں فرماتا ہے:

قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ

"اور وہ اپنے اعضاء سے کہیں گے تم نے ہمارے خلاف کیسے شہادت دیدی؟ تو وہ جواب دیں گے کہ ہمیں اسی خدا نے گویا بنایا ہے جس نے سب کو گویائی عطا کی ہے (تاکہ ہم حقائق بیان کریں)"

البتہ ایک زمانہ میں اس قسم کے مسائل کا تصور کرنا مشکل تھا، لیکن علم کی ترقی کے پیش نظر مناظر اور آواز کو رکارڈ اور ضبط کرنے کے نمونوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد یہ چیز باعث حیرت نہیں ہے۔

بہرحال اگرچہ عالم آخرت کی نعمتوں کے بارے میں ہمارا تصور صرف دور سے نظر آنے والی ایک جسم کی سیاہی کے مترادف ہے اور ان کی وسعت اور اہمیت سے صحیح معنوں میں آگاہ نہیں ہو سکتے ہیں، لیکن اس حد تک جانتے ہیں کہ اس عالم کی نعمتیں اور سزائیں، جسمانی اور روحانی دونوں صورتوں میں ہیں، کیونکہ

معاد دونوں پہلو رکھتی ہے لہذا فطری طور پر اس کی جزاء وسزا بھی دونوں جنبوں کے ساتھ ہونی چاہئے۔یعنی جس طرح مادی وجسمانی جنبوں کے بارے میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ڎ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۵

"پیغمبر: آپ ایمان اور عمل صالح والوں کو بشارت دیں کہ ان کے لئے ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں بھی ہوں گی اور انھیں اس میں ہمیشہ رہنا بھی ہے۔"

اسی طرح قرآن مجید، معنوی نعمتوں کے بارے میں بھی سورہ توبہ کی آیت نمبر ۷۲ میں ارشاد فرماتا ہے:

وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ

"(بہشتیوں کو ملنے والی) اللہ کی خوشنودی اور رضایت ان تمام نعمتوں سے برتر ہے۔"

جی ہاں، بہشتی اس احساس سے کہ خداوند متعال ان سے راضی ہے اور پروردگار عالم نے انھیں قبول کیا ہے، اس قدر خوشنودی اور لذت کا احساس کرتے ہیں کہ اس کا کسی چیز سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔جہنمیوں کے بارے میں بھی جسمانی عذاب اور آگ کے علاوہ ان پر خداوند متعال کا خشم و غضب اور اس سے ناراضگی ہر جسمانی عذاب سے بدتر ہے۔

اعمال کا مجسم ہونا

قابل توجہ بات یہ ہے کہ قرآن مجید کی بہت سی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے دن ہمارے اعمال زندہ ہوں گے اور مختلف شکلوں میں ہمارے ساتھ ہوں گے، جزاوسزا کی اہم باتوں میں سے ایک یہی اعمال کا مجسم ہونا ہے۔

ظلم وستم، کالے بادلوں کی صورت میں ہمارا محاصرہ کریں گے جیسا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث میں آیا ہے:

الظّلم هو الظّلمات يوم القيامة

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

"ظلم قیامت کے دن تاریکیاں ہے"

ناجائز طریقے سے کھایا ہوا یتیموں کا مال آگ کے شعلوں کے مانند ہمیں گھیر لے گا۔اس سلسلہ میں سورہ نساء کی آیت نمبر ۱۰ مین ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ﴿١٠﴾

"جولوگ ظالمانہ انداز سے یتیموں کا مال کھاجاتے ہیں وہ درحقیقت اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اورعنقریب واصل جہنّم ہوں گے۔"

ایمان، نور وروشنی کی صورت میں ہمارے اطراف کو منور کرے گا۔اس سلسلہ میں سورہ حدید کی آیت نمبر ۱۲ میں ارشادالہی ہے:

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُمْ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ

"اس دن تم باایمان مردوں اور باایمان عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ایمان ان کے آگے آگے اور داہنی طرف چل رہاہے"

سودخور، جنھوں نے اپنے برے اور بےشرمانہ عمل سے معاشرہ کے اقتصادی توازن کو درہم برہم کیا ہوگا، وہ مرگی کے مریضوں کی طرح ہوں گے جو اٹھتے وقت اپنا توازن برقرار رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، کبھی زمین پر گرتے ہیں اور کبھی لڑکھڑاتے ہوئے اٹھتے ہیں۔(سورہ بقرہ/ ۲۷)

جو مال ذخیرہ اندوزوں اور مالدار کنجوسوں نے جمع کرکے اس سے محروموں کا حق ادا نہیں کیا ہے، وہ ان کے لئے ایک بھاری طوق کے مانند ان کی گردن میں اس طرح لٹکادیا جائے گا کہ وہ حرکت کرنے کی طاقت نہ رکھیں گے۔

سورہ آل عمران کی آیت نمبر ۱۸۰ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَهُمْ ۖ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَهُمْ ۖ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ

"اورخبردار جولوگ خدا کے دئے ہوئے میں بخل کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ نہ سوچنا کہ

مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور

اس بخل میں کچھ بھلائی ہے۔ یہ بہت برا ہے اور عنقریب جس مال میں بخل کیا ہے وہ روز قیامت ان کی گردن میں طوق بنا دیا جائے گ"

اسی طرح تمام اعمال اپنی مناسب صورت میں مجسم ہوں گے۔

ہم یہ جانتے ہیں کہ علم وسائنس نے ثابت کیا ہے کہ کوئی بھی چیز دنیا میں نابود نہیں ہوتی ہے بلکہ مادہ اور قوت (انرجی) ہمیشہ اپنی شکل وصورت بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے افعال اور اعمال بھی نابود ہوئے بغیر ان دونوں صورتوں سے خارج نہیں ہیں اور اس قانون کے حکم کے مطابق جاودانی اور ابدی حالت میں ہیں، اگر چہ ان کی شکل وصورت بدل جائے۔

قرآن مجید ایک مختصر اور لرزہ خیز عبارت میں قیامت کے بارے میں فرماتا ہے:

وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۭ (سورہ کہف/ ۴۹)

"اور سب اپنے اعمال کو بالکل حاضر پائیں گے"

حقیقت میں انسان جو کچھ پاتا ہے وہ اس کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے، لہذا خداوند متعال اسی آیت کے ذیل میں فوراً فرماتا ہے:

وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ۝۴۹ (سورہ کہف/ ۴۹)

"تمھارا پروردگار کسی ایک پر بھی ظلم نہیں کرتا ہے"

ایک دوسری جگہ پر سورہ زلزال کی آیت نمبر ۶ میں فرماتا ہے:

يَوْمَىِٕذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ڏ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝۶

"اس روز سارے انسان گروہ در گروہ قبروں سے نکلیں گے تا کہ اپنے اعمال کو دیکھیں۔"

اسی سورہ زلزال کی آیت نمبر ۷ اور ۸ میں ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝۷ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝۸

"پھر جس شخص نے ذرہ برابر نیکی کی ہے وہ اسے دیکھے گا اور جس نے ذرہ برابر برائی کی ہے وہ اسے دیکھے گا"

مذکورہ آیات میں قابل غور نکتہ یہ ہے کہ فرماتا ہے کہ خود ان اعمال کو دیکھے گا۔

اس حقیقت کو مدنظر رکھنا یعنی اسی دنیا کے ہمارے چھوٹے بڑے اور نیک وبد اعمال کا محفوظ اور ثابت رہنا اور نابود نہ ہونا اور قیامت کے دن ہر جگہ ان کا ہمارے ساتھ رہنا سب کے لئے ایک انتباہ ہوسکتا ہے تا کہ ہم اپنے برے اعمال اور گناہوں کے مقابل ہوشیار رہیں اور اپنے نیک اعمال کے چاہنے والے اور ان پر ثابت قدم رہیں۔

تعجب کی بات ہے کہ دوحاضر میں ایسے آلات ایجاد کئے گئے ہیں کہ اس مسئلہ کے ایک حصہ کو اسی دنیا میں ہمارے لئے مجسم کیا جا سکتا ہے:

ایک دانشور لکھتا ہے: سائنس دان آج مصری کمہاروں کی دو ہزار سال قدیمی آواز کو اسی طرح منعکس کر سکتے ہیں کہ وہ آواز سننے کے قابل ہے۔ کیونکہ مصری عجائب گھروں میں دو ہزار سال پرانے کوزے موجود ہیں کہ انھیں مخصوص چرخوں اور ہاتھوں سے بناتے وقت کمہاروں کی آواز کی لہریں کوزوں کے جسمون میں نقش ہو گئے ہیں اور آج ان لہروں کو نئے سرے سے اس طرح زندہ کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنے کانوں سے انھیں سن سکتے ہیں(۱)۔

بہر حال مسئلہ معاد اور قرآن میں ذکر شدہ نیک لوگوں کی ابدی جزا اور بدکاروں کی دائمی سزا کے بارے میں بہت سے سوالات کا جواب "اعمال کے مجسم ہونے" اور ہر اچھے اور برے کام کے انسان کے جسم وروح پر اثر ڈالنے اور اس اثر کے ہمیشہ ہمارے ساتھ رہنے کے پیش نظر دیا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کتاب "راہ طے شدہ" سے ماخوذ۔

غور کیجئے اور جواب دیجئے

۱۔ جسمانی معاد سے مراد کیا ہے؟

۲۔ جسمانی معاد کے منکرین کیا کہتے ہیں اور قرآن مجید ان کا کیسے جواب دیتا ہے؟

۳۔ جسمانی معاد کے لئے عقلی استدلال کیا ہے؟

۴۔ عدل وانصاف کے قانون اور جسمانی معاد کے درمیان کون سا رابطہ ہے؟

۵۔ شبہہ "آکل وماکل" سے مراد کیا ہے اور اس کا جواب کیا ہے؟